دعوت اور جہاد

عصر حاضر کے تناظر میں

ڈاکٹر محمد رفعت

مطبوعات ہیومن ویلفیر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۱۵۰۱

نام کتاب : دعوت اور جہاد عصر حاضر کے تناظر میں

مصنف : ڈاکٹر محمد رفعت

صفحات : ۱۶۰

اشاعت

پہلا ایڈیشن : فروری ۲۰۱۸ء

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : ۱۰۰/- روپے

ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

فون: ۲۶۹۸۱۶۵۲، ۲۶۹۸۴۳۴۷

E-mail: mmipublishers@gmail.com

Website: www. mmipublishers.net

مطبوعہ : کائزن آفسٹ، نئی دہلی۔ ۲۰

ISBN 81-8088-486-4

DAWAT AUR JIHAD Asr-e-Hazir ke Tanazur Mein *(Urdu)*

Dr. Muhammad Rafat

Pages:160

Price: ₹100.00

ترتیب

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب میں اقامتِ دین کے مراحل اور خاص طور پر دعوت اور جہاد کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ اصلاً ان مضامین پر مشتمل ہے جو گزشتہ چند برسوں میں ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی کے ادارتی صفحات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں ہر شخص کو سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی آزادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسانوں کو بھیجا ہے اور ان کے سامنے حق و باطل، صحیح و غلط اور خیر و شر کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ ساتھ ہی ان کو پوری آزادی بھی دی ہے کہ وہ جو طریقۂ زندگی اپنے لیے بہتر سمجھیں اسے اختیار کر سکتے ہیں، لیکن یہاں ہمیشہ طاقت وروں نے دوسروں پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش کی ہے، کم زوروں کو دبا کر رکھا ہے اور ان پر اپنا ارادہ و اختیار مسلط کیا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اللہ کے بندے اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اس کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔ وہ اہل ایمان کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ ان تک اللہ کا پیغام پہنچائیں، اس کے لیے مختلف تدابیر اور ذرائع اختیار کریں اور انھیں آزادانہ ماحول میں غور و فکر کے مواقع فراہم کریں۔ اسی لیے جو لوگ اس راہ میں مزاحم بنتے ہیں اور دوسرے انسانوں پر جبر اور ظلم روا رکھتے ہیں، اسلام اپنے ماننے والوں کو ان کا مقابلہ کرنے اور ان کے زور کو توڑنے کا حکم دیتا ہے۔ یہی اسلام میں جہاد کی مشروعیت کی بنیاد ہے۔ موجودہ دور میں 'جہاد' کے بارے میں بہت زیادہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسے دہشت گردی کے مترادف بنا دیا گیا ہے، حالاں کہ اگر درست اور وسیع تناظر میں اس پر غور کیا جائے تو کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

اس کتاب میں، جو بارہ (۱۲) مضامین پر مشتمل ہے، دین کی اقامت اور غلبہ کے طریقۂ کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے دعوتِ دین کی ضرورت و اہمیت، اس کے نکات اور طریقۂ کار، مخاطبین کی نفسیات اور دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے کے اسباب، عصر حاضر کے مزاج اور اسلوبِ دعوت اور معاصر دنیا میں دعوت کے محاذ پر اظہارِ خیال کیا ہے اور آخر میں اس سے بحث کی ہے کہ اس راہ میں جہاد کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟ اور اس کے کیا شرائط، آداب اور حدود ہیں؟

امید ہے، اس کتاب سے عصری تناظر میں دعوت و جہاد کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

محمد رضی الاسلام ندوی

۱۵؍فروری ۲۰۱۸ء — سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

فلاح وکام یابی کا راستہ

فلاح، کامرانی اور کام یابی کی تمنا ہر شخص کرتا ہے۔ شاید کوئی انسان ایسا نہ ہوگا جو کامیاب نہ ہونا چاہتا ہو اور جو یہ کہے کہ میں ناکامی کو پسند کرتا ہوں۔ انسان کے دل کی یہ تمنا پوشیدہ ہوتی ہے، لیکن انسان کی مختلف حرکات وسکنات سے مسلسل اپنے وجود کا پتہ دیتی رہتی ہے۔ اگر انسان کے دل کو ٹٹولا جا سکے، یا وہ اپنے دِل کی بات زبان پر لانے پر آمادہ ہو تو یقیناً وہ زبان سے بھی یہی کہے گا کہ کام یابی میرا مقصد اور میرا ہدف ہے۔ انسانوں میں تمام اختلافات کے باوجود کام یابی کی جستجو اور تلاش پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ انسان آج کے زمانے کا ہو یا آج سے ہزاروں سال قبل کا، ناخواندہ ہو یا تعلیم یافتہ، مہذب ہو یا ناآشنائے تہذیب وتمدن، شہری ہو یا دیہاتی، مرد ہو یا عورت، سب کام یاب ہونا چاہتے ہیں اور کوئی نہیں چاہتا کہ ناکامی اس کے نصیب میں آئے۔

کام یابی کا مفہوم

لیکن کام یابی ہے کیا؟ کس انسان کو ہم کام یاب کہیں گے اور کسے ناکام؟ اس سوال کے جواب میں انسانوں میں اتفاق نہیں پایا جاتا۔ کام یابی کی تعریف اور اس کے پیمانے مختلف ہیں۔ کوئی عزت وشہرت کو کام یابی سمجھتا ہے۔ کسی کے نزدیک اقتدار اور حکومت کا حصول کام یابی ہے۔ کسی کے خیال میں علم وتحقیق کی بلندیوں پر پہنچ جانا کام یاب ہو جانا ہے اور کسی کے خیال میں ایک اچھے کیریئر (Career) یعنی مفید معاشی مصروفیت

و مادی سہولیات اور مال و دولت کا حاصل ہو جانا کام یابی ہے۔

ان اختلافات کی موجودگی میں یہ طے کرنا کہ 'کامیابی کیا ہے؟' بہ ظاہر ایک مشکل مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے، اگر ہم انسان کی فطرت پر غور کریں اور خود کام یابی کے سلسلے میں اپنے دل کو بھی ٹٹول کر دیکھیں کہ وہ حقیقی کام یابی کس چیز کو سمجھتا ہے؟

انسانی وجود کی معرفت

انسان کا وجود کوئی سادہ وجود نہیں بلکہ وہ اپنے متعدد پہلو رکھتا ہے۔ ہر پہلو اس لائق ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔ فطرت انسانی کا معتدل، متوازن اور جامع تصور اسی وقت ہماری گرفت میں آسکتا ہے، جب وجود انسانی اور شخصیت انسانی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

ایک اعتبار سے انسان مادی وجود ہے اور طبعی قوانین میں جکڑا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے وہ کائنات کی بے جان و بے شعور اشیاء سے مماثلت رکھتا ہے۔ جس طرح ایک پتھر کو زمین کششِ ثقل سے اپنی طرف کھینچتی ہے اسی طرح انسان کو بھی کھینچتی ہے۔ جس طرح ایک مکان جگہ گھیرتا ہے اسی طرح انسان کو بھی اپنے لیے جگہ (Space) درکار ہوتی ہے۔ جس طرح بے جان اشیاء چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہیں اسی طرح انسان بھی ہے۔ لیکن غالباً کوئی انسان بھی یہ ماننے پر آمادہ نہ ہوگا کہ وہ محض پتھر جیسا ایک مادی وجود ہے اور اس کی حقیقت ایٹموں کے مجموعے کے علاوہ کچھ نہیں۔ انسان کا دل اندر سے پکار کر کہتا ہے کہ وہ محض 'عناصر کا مجموعہ' نہیں اور اس کی حقیقت پہاڑوں اور پتھروں سے کہیں عظیم تر ہے۔

ایک اور اعتبار سے انسان ایک حیوانی وجود ہے۔ مغرب کا فلسفہ انسان کو ترقی یافتہ حیوان ہی قرار دیتا ہے۔ حیوانات کی طرح انسان سانس لیتا ہے، ماحول کے عوامل سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی نسل بڑھاتا ہے۔ اسے غذا اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ انسان میں وہ اخلاقی حس (Ethical Sense) پائی جاتی ہے جو حیوانات میں نہیں نظر آتی؟ اور اس بنا پر اسے محض حیوان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایک اور اعتبار سے انسان ایک اجتماعی جان دار (Social Animal) ہے۔ وہ

تمدنی زندگی کو پسند کرتا ہے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر رہنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مغربی مفکرین نے سماجی بندھنوں کو انسان کے وجود کی اصل حقیقت قرار دیا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ سماجی تعلقات کا تانابانا (Structure of Social Relations) ہی وہ شے ہے جو شخصیت انسانی کی تعمیر کرتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک زبردست خودی پائی جاتی ہے جو اپنے ذاتی اور انفرادی وجود پر اصرار کرتی ہے۔ اس لیے انسان اجتماعیت کے اندر اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھتا ہے۔ یہ جذبۂ انفرادیت بسا اوقات کشمکش کی شکل بھی اختیار کرتا ہے، جب انسان اجتماعی اداروں سے بغاوت کرتا ہے اور ان کو اپنے خیال کے مطابق درست نہ پاکر انھیں درست کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک نئے نظام کا تصور پیش کرتا ہے۔ تمام فکری و سیاسی انقلابات کی بنیاد بعض مفکرین کے افکار ہیں جو انھوں نے زیادہ تر اپنی انفرادی حیثیت میں پیش کیے اور ان افکار میں وقت کے مسلّمہ اجتماعی نظاموں کو چیلنج کیا۔ اس لیے انسان کو ہم محض اجتماعی وجود قرار نہیں دے سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض اعتبار سے انسان جمادات، حیوانات اور اجتماعی زندگی گزارنے والے جان داروں سب سے مختلف ہے۔ اس کے اندر پوشیدہ حقائق کو جاننے کی شدید خواہش پائی جاتی ہے جو دوسری مخلوقات میں نظر نہیں آتی۔

بڑی بات یہ ہے کہ انسان جذبۂ عبادت رکھتا ہے۔ اس جذبے نے قدیم ترین انسان سے لے کر آج تک کے انسانوں کو عبادت گاہیں تعمیر کرنے اور مراسمِ عبودیت انجام دینے پر آمادہ کیا ہے۔ یہ جذبہ حیوانات میں نظر نہیں آتا۔ انسان میں تسخیرِ کائنات کا داعیہ پایا جاتا ہے جو اسے ایک منزل کے بعد دوسری منزل کے حصول کے لیے بے چین رکھتا ہے۔ اس کے اندر اخلاقی حس پائی جاتی ہے جو انسانی ادب، آرٹ، مذہبی تصورات اور نظامِ قوانین کی اصل روح ہے۔ ان ساری خصوصیات میں انسان بے مثل ہے۔ ان کو ہم خالص 'انسانی خصوصیات' کہہ سکتے ہیں۔ اسلام نے ان خصوصیات کو اس ایک بنیادی نکتے میں بیان کیا ہے کہ ''انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔''

انسان کے اللہ کے خلیفہ یا نائب ہونے کے چند اہم نتائج ہیں، جو فطرتِ انسانی

کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں:

(۱) اللہ کا نائب ہونے کی حیثیت سے انسان ارادہ واختیار کی طاقت رکھتا ہے۔ انسان کی اخلاقی حس اسی اختیار کی بنا پر ہے۔ نیکی اور بدی، خیر اور شر، اچھے اور برے میں تمیز اور خیر کو اختیار کرنے کا شدید اخلاقی تقاضا، یہ انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔

(۲) چوں کہ انسان اللہ کا نائب ہے اس لیے اسے محدود انسانی پیمانے پر اللہ کی صفات کا پرتو (Shadow) ملا ہے۔ اس لیے انسان علم کی طلب رکھتا ہے۔ علم اصلاً اللہ کی صفت ہے۔ علم کی طلب کی اس خصوصیت نے انسانی تاریخ میں مسلسل علمی ترقی کے لیے ایک مہمیز کا کام کیا ہے۔

(۳) انسان اللہ کا نائب ہے اور اللہ نے کائنات کی بہت سی اشیاء کو انسان کے لیے مسخر کردیا ہے۔ اس لیے انسان تسخیرِ کائنات کا جذبہ رکھتا ہے۔ یہ جذبہ انسان کے تمدنی ارتقاء کی بنیاد ہے۔

(۴) انسان کے لیے وہ ذات جو Ideal اور نمونے کی حیثیت رکھتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے کہ زمین کی جو مخلوقات انسان کے دائرۂ علم میں ہیں وہ انسان سے کم تر ہیں۔ محض اللہ کی ذات انسان سے بالاتر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ تمام عیوب، نقائص اور کم زوریوں سے پاک ہے۔ اس لیے وہ انسان کا ideal معیارِ مطلوب ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ:۱۳۸) ''اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہوگا۔''

یہ اس حقیقت کی طرف رہ نمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ بلند ترین معیار ہے جو انسان کے سامنے ہوسکتا ہے۔ یہ انسان کی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ مادی اور حیوانی وجود کے باوجود اپنی نگاہیں پستی کی طرف نہیں بلکہ بلندی کی طرف رکھتا ہے۔ یہ بلندی اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے وابستہ ہے۔ اس لیے کہ انسان سے بلند تر اسی کی ہستی ہے۔

(۵) انسان کے لیے جو ذات بندگی اور اطاعت کی مستحق ہوسکتی ہے، وہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ خود انسانوں کا اپنے جیسے انسانوں کی بندگی اختیار کرنا بالکل غلط اور بے محل

ہے۔ اس لیے کہ بہ حیثیت انسان، سارے انسان برابر سطح پر ہیں۔ رہیں دوسری زمینی مخلوقات تو وہ انسان سے کم تر ہیں اور زمین پر محدود اقتدار اور حکم رانی ان مخلوقات کی نہیں ہے۔ اس واقعہ کی موجودگی میں انسان کی اطاعت اور بندگی کا مستحق صرف اللہ ہے۔

انسانی خصوصیات کا تناظر

فطرتِ انسانی کی مندرجہ بالا وضاحت سے اختلاف کرنا غالباً ممکن نہیں۔ ارادہ و اختیار کی طاقت، تسخیرِ کائنات کا جذبہ، حقیقت تک پہنچنے کی آرزو، اخلاقی حس اور خیر و شر میں امتیاز، روحانی بلندیوں اور حقائقِ غیب کی تلاش۔ نیز جذبۂ عبادت و پرستش انسانی خصوصیات ہیں اور دوسری زمینی مخلوقات میں یہ صفات ہم کو نظر نہیں آتیں۔ آخر ان صفات کی توجیہ کیا ہے؟ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے یا انسان کو اس کا بندہ و نائب نہیں سمجھتے، وہ ان صفات کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ اگر خدا موجود نہیں ہے تو انسان کے اندر اس کی طلب اور جستجو کیوں ہے؟ بقولِ شاعر ؎

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
یہ درد میں دل کشی سی کیوں ہے، اگر وہ درد آشنا نہیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ اس مادی اور طبعی کائنات میں انسانی صفات رکھنے والی انسان نامی مخلوق کا وجود خود اللہ کے وجود کی ایک واضح نشانی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا انکار کر دیا جائے تو انسان کے وجود کی کوئی توجیہ ممکن نہیں۔ شاعر نے یہی بات ان لفظوں میں کہی ہے: ؎

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

کام یابی کی تعریف

اب ہم اس سوال کی طرف لوٹتے ہیں کہ کام یابی کیا ہے؟ یقیناً کام یابی کا وہی تصور درست ہو سکتا ہے جو انسان کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہو اور انسانی شخصیت کے تمام

پہلوؤں کی رعایت کرتا ہو۔ اس کے ساتھ ہم اپنے دل کو ٹٹولیں تو وجدانی سطح پر ہر انسان اس بات سے آگاہ ہے کہ کام یابی کیا ہے؟ غور کیا جائے تو انسان کا دل دو باتوں کے حصول کو کام یابی قرار دیتا ہے:

۱۔ اطمینانِ قلب

۲۔ تکمیلِ ذات یا اپنی شخصیت کا مکمل ارتقا۔

بہ ظاہر انسان مال، دولت، آسائش، اقتدار، عزت اور شہرت سب کا طلب گار ہے۔ لیکن ان چیزوں کے ذریعہ جو اصل شے اس کی مقصود ہے، وہ اطمینانِ قلب ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ سب مادی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن اطمینان قلب اسے حاصل نہیں ہوتا۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ مادی وسائل اور سہولیات سے محروم شخص کا دل بالکل مطمئن ہوتا ہے اور اسے جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح انسان دوسری چیز جو چاہتا ہے، وہ اپنی ذات کی تکمیل اور اپنی شخصیت کا ارتقا ہے۔ علم کی طلب اور اس کا حصول، حقیقتوں کی جستجو اور ان کا انکشاف انسان کی ذات کی تکمیل ہی کے کچھ پہلو ہیں۔ اخلاقی بلندیوں کا حصول بھی تکمیل ذات کا ایک حصہ ہے۔ تسخیرِ کائنات کا جذبہ بھی اسی تکمیل ذات کی خواہش کی علامت ہے۔ اپنے سے بالاتر ہستی خدائے واحد کی ذات سے وابستگی اور اس کی رضا کی طلب، تکمیلِ ذات کے اس سفر کی معراج ہے۔

اب ہمیں اس راستے کی جستجو کرنی چاہیے، جو انسان کو کام یابی سے ہم کنار کر سکتا ہے یعنی اسے قلب کے اطمینان سے بہرہ ور کر سکتا ہے اور اس کی ذات کی تکمیل اور شخصیت کے ارتقا کا سامان فراہم کر سکتا ہے۔

اطمینانِ قلب کا حصول

اسلام انسان کے اس مطالبے کو پورا کرتا ہے۔ یعنی اطمینانِ قلب اور تکمیلِ ذات کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس بنا پر ہم پورے یقین کے ساتھ اسلام کو کام یابی کا راستہ قرار

دے سکتے ہیں۔ اطمینانِ قلب کے حصول کے لیے اسلام کی رہ نمائی یہ ہے:

۱۔ اسلام کی دَین یہ ہے کہ اسلام کائنات اور انسانی زندگی کے معمے کا حل انسان کو بتاتا ہے۔ مشہور روایت کے مطابق گوتم بدھ کے سامنے حیاتِ انسانی کا معمہ اس سوال کی شکل میں سامنے آیا کہ ''کائنات میں دکھ کیوں ہے اور انسان اس دکھ سے کس طرح نجات پاسکتا ہے؟'' اس سوال کی وجہ ان کا یہ مشاہدہ تھا کہ کائنات میں دکھ ہی دکھ ہے۔ یہاں زندگی ہے مگر اس کا انجام موت ہے۔ یہاں سرسبزی وشادابی ہے مگر مرجھا جانے اور ختم ہوجانے کے لیے ہے۔ یہاں صحت وتوانائی ہے مگر بیماری اور ضعف اس کے تعاقب میں ہیں۔ گوتم بدھ نے اس سوال کا یہ جواب تلاش کیا کہ دکھ کی وجہ انسان کی خواہش ہے اور دکھ کا علاج خواہش کا خاتمہ ہے۔

اسلام کی نظر میں نہ یہ مشاہدہ درست ہے، نہ اس کی توجیہ درست ہے اور نہ علاج درست ہے۔ اسلام کائنات کے معمے کے بارے میں انسان کو بتاتا ہے کہ یہ کائنات اللہ نے ایک منصوبے کے تحت بنائی ہے اور اس کے بعد آخرت آنے والی ہے:

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝ (الاحقاف:۳)

''ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ اور ایک متعین مدت کے لیے۔ مگر انکار کرنے والے اس حقیقت سے (یعنی آخرت سے) جس سے ان کو آگاہ کیا گیا ہے، منھ موڑ رہے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت کی آمد کو نظر انداز کردیا جائے تو یہ دنیا انسان کو بے مقصد نظر آئے گی، اس میں بے انصافی، ظلم اور عدم توازن نظر آئے گا اور یہ دکھ، تکالیف اور مصائب کا مجموعہ معلوم ہوگی۔ لیکن جونہی اس حقیقت کا ادراک انسان کو ہوگا کہ یہ موجودہ دنیا محض پہلا مرحلہ ہے اور اصل مرحلہ وہ ہے جو آخرت میں سامنے آنے والا ہے، تو اس پورے خدائی منصوبے کی حکمت اس کی سمجھ میں آجائے گی اور کائنات کے معمے سے پریشان اور الجھنوں کا شکار انسان حقیقت پاکر مطمئن ہوجائے گا۔ اسلام جس معرفت سے

انسان کو بہرہ ور کرتا ہے اس کو پا کر اطمینانِ قلب کی پہلی شرط پوری ہو جاتی ہے۔

۲۔ اطمینان قلب کے لیے دوسری ضرورت زندگی کی مشکلات میں ایک مضبوط سہارے کی ہے۔ اسلام یہ سہارا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کی شکل میں فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ نِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ (الحج:۷۸) ہے۔ یعنی ”کیا ہی بہترین آقا (ولی وسر پرست) ہے اور کیا ہی بہترین مددگار۔“

اہلِ ایمان ایک طرف اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ اللہ ان کا حامی و مددگار ہے اور دوسری طرف وہ یہ جانتے ہیں کہ دنیا کی پوری زندگی آزمائش ہے۔ اس لیے یہاں کے مصائب و آلام سے گھبرانے کے بجائے ان کو آزمائش سمجھ کر ہر حال میں حق وصداقت پر قائم رہنا چاہیے۔ یہی صبر ہے جو اہلِ ایمان کی ایک بنیادی صفت ہے۔

۳۔ غیبی حقائق نظروں کے سامنے نہیں رہتے تو انسان بے اطمینانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ، اس کی صفات اور آخرت کو مسلسل یاد دلانے کے لیے اسلام نے اللہ کے ذکر کی تلقین کی ہے۔ اس ذکر کی اعلیٰ ترین شکل نماز ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِیۡ ○ (طٰہٰ:۱۴) ”میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔“ نماز کے علاوہ ذکر کی دوسری شکلوں کی بھی اسلام تلقین کرتا ہے۔ دل اور زبان اللہ کی یاد کرتے رہیں تو انسان کو حقائق یاد رہتے ہیں۔ محسوس دنیا کے حقائق بھی اور عالم غیب کے حقائق بھی۔ اس طرح وہ بے اطمینانی سے نجات پاتا ہے اور اطمینانِ قلب کی دولت پالیتا ہے:

اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ○ (الرعد:۲۸)

”بے شک دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں۔“

شخصیت کا ارتقا

اسلام نے انسانی شخصیت کے ارتقا اور انسان کی ذات کی تکمیل کا مکمل سامان فراہم کیا ہے۔ وہ ان تمام موانع کو دور کرتا ہے جو انسان کی ذات کی تکمیل میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

۱۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ اگر وہ اللہ کو اپنا ولی وسرپرست بنالے، تو وہ جہالت اور

گم راہی کے اندھیروں سے نکل کر صداقت وحق کی روشنی میں آجائے گا اور اس کی ترقی کی راہ کا بنیادی روڑا دور ہوجائے گا:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ

(البقرہ:۲۵۷)

''اللہ اہلِ ایمان کا سر پرست ہے۔ وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ اور انکار کرنے والوں کے سر پرست طاغوت ہیں۔ وہ ان کو روشنی سے نکال کر اندھیروں میں لے جاتے ہیں۔''

۲۔اسلام انسان کو بہت سے آقاؤں کی بندگی سے نکال کر اسے ایک اللہ کی بندگی میں لاتا ہے۔شرک کے پھندوں سے نکال کر توحید کی نعمت سے ہم کنار کرتا ہے اور اس طرح ارتقاءِ شخصیت کی راہ کا ایک اور بڑا روڑا دور ہوجاتا ہے۔توحید کو اپنانے کے بعد انسانی شخصیت کو مختلف طاقتیں متفرق سمتوں میں نہیں کھینچتیں بلکہ انسان اللہ وحدہ لاشریک کے لیے یکسو ہوجاتا ہے اور اس کی ترقی کی راہ کھل جاتی ہے۔

۳۔اسلام انسان کو دوسری مخلوقات کی بندگی سے نجات دلاتا ہے اور خود اسے اپنے نفس کی بندگی سے بھی آزاد کرتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ خواہشاتِ نفس کی غلامی انسان کی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔اسلام اس رکاوٹ کو دور کرتا ہے۔خواہشِ نفس کی غلامی سے نجات کے لیے اسلام صرف تلقین پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ ذکرِ الٰہی اور عبادات کے وہ طریقے بھی تجویز کرتا ہے، جو بتدریج انسان کو ضبطِ نفس پر قادر بنا دیتے ہیں۔

ان موانع کو دور کرنے کے ساتھ اسلام ایجابی طور پر وہ طریقے بتاتا ہے جن کو اپنا کر انسان اپنی ذات کی تکمیل کرسکتا ہے اور اپنی شخصیت کو مکمل ترقی دے سکتا ہے۔اسلام کے تجویز کردہ یہ طریقے درج ذیل ہیں:

۱۔رضائے الٰہی کا نصب العین: اس واضح نصب العین کو اپنانے کے بعد انسانی سرگرمیوں کو ایک محور اور مرکز مل جاتا ہے اور انسان کی سرگرمیاں منتشر رہنے کے بجائے منظم

اور مرتکز ہو جاتی ہیں۔

۲۔ارکان اسلام: اسلام کے ارکان بیک وقت غیبی حقائق کا شعور تازہ رکھتے ہیں اور انسان کو دوسرے صالح انسانوں کے ساتھ بھی جوڑتے ہیں تاکہ یہ سب ایک دوسرے کی ترقی میں معاون بن سکیں۔

۳۔انفاق فی سبیل اللہ: یہ عمل انسان کے دل کو پاک کرتا ہے اور انسانی شخصیت کو بلندیوں تک لے جانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

۴۔آیاتِ الٰہی پر غور: انفس و آفاق میں بکھری ہوئی اللہ کی نشانیوں پر غور کر کے انسان اپنے ایمان و یقین کو گہرا، واضح اور مضبوط بناتا ہے۔ اللہ کی ان نشانیوں پر غور سے انسان بالآخر معرفت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے، جہاں اس کے لیے غیبی حقائق کو یاد رکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

۵۔علم کتاب و حکمت کا حصول: اسلام کے نزدیک انسان کی ذات کا ارتقاء متوازن ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ اخلاقِ حسنہ اور روحانی پاکیزگی پر جتنا زور دیتا ہے اتنا ہی زور علم کے حصول اور حکمت کی تلاش پر بھی دیتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲)

''وہ اللہ ہے جس نے اُمیوں میں خود ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اس آیت میں انسانوں کی شخصیت کے ارتقاء کے لیے ضروری تمام اقدامات بتا دیے گئے ہیں۔

۶۔شریعتِ الٰہی کی پابندی: انسان کی شخصیت کے ارتقاء کے لیے اسلام تلقین کرتا ہے کہ انسان کو احکامِ الٰہی کی مکمل پابندی اختیار کرنی چاہیے۔ حدودِ الٰہی کے اندر زندگی گزارنے سے انسان ان تمام چیزوں سے بچ جاتا ہے جو اس کی ترقی کی راہ روک سکتی ہیں اور اس راستے پر اس کے قدم جمے رہتے ہیں جو ارتقاء اور تکمیل کی طرف جاتا ہے۔

انسانی ذات کی تکمیل اور شخصیت کے ارتقاء کے اس پروگرام کے لیے اسلام کا دیا ہوا جامع عنوان 'تزکیہ' ہے۔ اسلام اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ جو لوگ بھی تزکیہ اختیار کریں گے وہ فلاح پائیں گے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ (الشمس:۹)

''بے شک وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا۔''

اسلام نے تزکیہ کے اپنے تجویز کردہ لائحۂ عمل میں ان امور کا تذکرہ نہیں کیا ہے جن کو انسان اپنی جبلت کی وجہ سے اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ مثلاً: کائنات کو مسخر کرنے کی کوشش، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے تگ و دو، لطف وتفریح کے سامان کی فراہمی وغیرہ۔ ان امور میں اسلام اس امر پر اعتماد کرتا ہے کہ انسان اپنی فطرت اور ضروریات سے مجبور ہو کر ان میدانوں میں پیش رفت کرے گا اور ان پہلوؤں سے بھی اس کی شخصیت کا ارتقاء ہو سکے گا۔ البتہ ان سارے امور میں وہ توازن و اعتدال اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی کماحقہ رعایت کی تعلیم دیتا ہے، تاکہ زندگی کے یہ دیگر پہلو نظر انداز نہ ہونے پائیں۔ اسلام یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ ان سارے میدانوں میں پیش رفت کرتے ہوئے انسان ذکرِ الٰہی کا اہتمام کرے، اللہ کے شکر کے جذبے سے سرشار رہے اور اس کے حدود کی پابندی کرے۔

قرآنی رہ نمائی

کام یابی کے راستے کا مثبت تعارف قرآن مجید نے اس طرح کرایا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ

عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ○ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ○ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ○ (المؤمنون:١-١١)

''بے شک فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، جو لغو کاموں اور باتوں سے دور رہتے ہیں، جو زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہیں کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی نگہ داشت کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ وارث ہیں، جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اسی طرح منفی تعارف یوں کرایا گیا ہے:

وَ الۡعَصۡرِ○ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ○ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ○ (العصر)

''زمانہ گواہ ہے کہ اِنسان خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک اعمال کیے، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور صبر کی تلقین کی۔''

☆☆☆

اخلاقی حِس، سماجی روایت اور حق پرستی

انسانی شخصیت کی درست معرفت کے لیے اُس کی ماہیت سے متعلق دو اہم صداقتوں — اخلاقی حس اور آزادیِ انتخاب — کا ادراک ضروری ہے۔ ان میں سے پہلی صداقت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ہر انسان صالح فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ فطری طور پر ہر انسان کا وجدان اس حقیقت سے واقف ہوتا ہے کہ اس کا ایک رَب ہے، جس نے اُسے تخلیق کیا ہے اور جو تنہا عبادت کا مستحق ہے۔ اسی طرح اُس کی فطرت اپنے خالق کے سامنے جواب دہی کا احساس بھی رکھتی ہے۔ انسان فطری طور پر یہ بھی جانتا ہے کہ سچائی، دیانت داری، حیا اور عدل و انصاف اچھی خصلتیں ہیں اور انسانی شخصیت کا حسن اِن اوصافِ حسنہ کی موجودگی سے وابستہ ہے۔ ان اچھی صفات کے برعکس کذب، بددیانتی، بے حیائی اور ظلم و زیادتی ناپسندیدہ ہیں اور انسانی شخصیت کے اندر بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ انسان کی اس فطرتِ صالحہ کا زندہ مظہر، انسانی ضمیر ہے جو نیکی اور بدی میں امتیاز کی صلاحیت رکھتا ہے اور نیکی کی طرف انسان کو مائل کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضمیر کو ''نفسِ لوامہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ○ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ○ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ○ (القیامہ: ۱-۳)

''نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے۔ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم (قیامت کے دن) اُس کی ہڈیاں جمع نہ کرسکیں گے۔''

انسانی ضمیر

مسلمان اہلِ علم انسانی شخصیت (یعنی نفسِ انسانی) کے سلسلے میں مسلسل غور کرتے رہے ہیں، اس لیے کہ نفس کا تزکیہ (جس کے معنی اصلاح اور نشوونما کے ہیں) دین میں اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ نفسِ انسانی میں ترقی کے بے پناہ امکانات موجود ہیں۔ ترقی کے مدارج کے سلسلے میں قرآنی ارشادات سے استفادہ کرتے ہوئے، اہلِ علم نے تین درجات کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

(۱) ''اگر انسان کا نفس، لہو ولعب (کھیل کود) کی جانب ہو، اس کو نہ نیکی کی طرف رغبت ہو اور نہ نیک کام میں اس کا جی لگے تو ایسے نفس کو ''نفس امارہ بالسوء'' کہتے ہیں۔ (۲) اگر نیک و بد اور حسن وقبح کا احساس کرے، کبھی کبھی برائی کا مرتکب ہو بیٹھے لیکن فوراً ہی متنبہ ہو کر اپنی خطا کا معترف ہو اور صدورِ عصیان پر اپنے آپ کو ملامت کرے تو ایسے نفس کو نفسِ لوامہ کہتے ہیں۔ (۳) اگر نفس، نیکی کا شائق اور بدی سے بیزار ہو، عبادت و ریاضت پر مائل، صبر وتحمل کا خوگر اور حسنِ اخلاق کا گرویدہ ہو تو ایسے پاک نفس کا نام، نفسِ مطمئنہ ہے۔''

سورۂ قیامہ کی مندرجہ بالا آیات کی تشریح بیان کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''یہاں نفسِ لوامہ کی قسم کھا کر اشارہ فرمایا کہ اگر فطرت صحیح ہو تو خود انسان کا نفس، دنیا ہی میں برائی اور تقصیر پر ملامت کرتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اپنی اعلیٰ اور اکمل ترین صورت میں قیامت کے دن ظاہر ہوگی۔''

مولانا صلاح الدین یوسف اِن آیات کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''(بیدار نفس) بھلائی پر بھی (ملامت) کرتا ہے کہ زیادہ کیوں نہیں کی۔ اور برائیوں پر بھی کہ اُن سے باز کیوں نہیں آتا؟ دنیا میں بھی جن کے ضمیر بیدار ہوتے ہیں، اُن کے نفس انھیں ملامت کرتے ہیں۔ تاہم آخرت میں تو سب کے ہی نفس ملامت کریں گے۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سورۂ قیامہ کی مندرجہ بالا آیات کی تشریح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس ضمیر میں لازماً، بھلائی اور برائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے۔ اور چاہے انسان، کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر، اسے کوئی برائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ اُس نے بھلائی اور برائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو، وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔

یہ (احساس) اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے، اُس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور برائی کی تمیز پائی جاتی ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور برے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔''

(تفہیم القرآن، جلد ششم سورۂ قیامہ، حاشیہ: ۲)

انسان کے اندر ضمیر اور اخلاقی حس کی موجودگی اتنی واضح اور بدیہی حقیقت ہے کہ اس کا انکار کم ہی لوگوں نے کیا ہے۔ البتہ اس اخلاقی حس کی توجیہ کے سلسلے میں غیب کے قائلین اور غیب کے منکرین کے درمیان، بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو سوچنے والے خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں اور غیبی حقائق کو تسلیم کرتے ہیں اُن کے نزدیک اخلاقی حس اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے اور انسان کا شرف و امتیاز، اخلاقی حس کی موجودگی سے وابستہ ہے۔ قرآنِ مجید نے اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے:

(۱) أَلَمْ نَجْعَلْ لَّهُ عَيْنَيْنِ○ وَ لِسَاناً وَّ شَفَتَيْنِ○ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ○ (البلد: ۸۔۱۰)

''کیا ہم نے اُس (انسان) کو دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور (نیکی اور بدی) کے دونوں نمایاں راستے اُسے نہیں دکھا دیے؟''

(۲) وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا○ فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا○ (الشمس: ۷۔۱۰)

''اور نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اُسے ہموار کیا پھر اس کی بدی اور پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اُسے دبا دیا۔''

(۳) وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ○ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْنِ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ○ (التین:۱-۴)

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی۔ اور طورِ سینا اور اس پُرامن شہر (مکہ) کی۔ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔''

یہ سورۂ التّین کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ سورۂ التّین کے مضامین کا تعارف کراتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے انسانی ساخت کے اخلاقی پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''انسانوں میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں: ایک وہ جو اس بہترین ساخت پر پیدا ہونے کے بعد برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اخلاقی پستی میں گرتے گرتے اس انتہا کو پہنچ جاتے ہیں، جہاں اُن سے زیادہ نیچ، کوئی دوسری مخلوق نہیں ہوتی۔ دوسرے، وہ جو ایمان و عملِ صالح کا راستہ اختیار کر کے اس گراوٹ سے بچ جاتے ہیں اور اس مقامِ بلند پر قائم رہتے ہیں جو ان کے بہترین ساخت پر پیدا ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔''

(تفہیم القرآن، جلد ششم دیباچہ سورۃ التین)

انسانی ضمیر اور سماجی روایات

غیب پر ایمان لانے والے، انسانی شخصیت میں ضمیر کی موجودگی کو اُن علامات میں شمار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی حکمتِ بالغہ کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ غیب کے قائل نہیں ہیں اور اس بنا پر خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانی ضمیر، محض سماجی روایات کا نام ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق انسانوں کو تجربے نے یہ بتایا کہ انسانی سماج کی بقا اور انسانوں کے درمیان باہمی تعاون کے لیے

بعض صفات ناگزیر ہیں (مثلاً سچائی اور دیانت داری وغیرہ)۔ اسی طرح لوگوں نے یہ دیکھا کہ جھوٹ اور فریب وغیرہ کے فروغ سے سماجی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سماج کے لیے مفید صفات کو مطلوب ٹھہرادیا اور مضر خصائل کو ناپسندیدہ اور غیر مطلوب قرار دیا۔ آہستہ آہستہ بعض اوصاف کے مطلوب یا غیر مطلوب ہونے کے اس تصور میں تقدس کا رنگ پیدا ہو گیا اور محض سماجی روایات کے بجائے انھیں اخلاقی حس سے تعبیر کیا جانے لگا۔ گویا منکرینِ غیب کے نزدیک جن معیارات کو اخلاقی معیارات کہا جاتا ہے وہ محض اپنی سماجی افادیت کی وجہ سے اختیار کر لیے گئے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ انسان کے وجودِ حیوانی میں 'فطرتِ انسانی' نامی شے واقعتاً پائی جاتی ہو، جو (سماجی تجربے سے قطعِ نظر) اخلاقی حس کی، بطورِ خود (Innate) موجودگی پر دلالت کرتی ہو۔

مادیت سے متاثر، انسانی ضمیر کی مندرجہ بالا توجیہ کو تسلیم کرنا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ ہزار کٹھ حجتیوں کے باوجود، انسان اپنے ان اندرونی احساسات کو نہیں جھٹلا سکتا جو کوئی برا فعل کر گزرنے کے بعد ضمیر کی ملامت کی صورت میں، اس کے اندرون میں نمودار ہوتے ہیں۔ مزید برآں ضمیر انسانی کی مادّی و تجرباتی تعبیر کے غلط ہونے کی قوی تر دلیل، یہ واقعہ ہے کہ جب کسی فرد (مثلاً زید) کو بکر کی بددیانتی یا فریب سے واسطہ پیش آتا ہے تو زید کو سخت شکایت ہوتی ہے اور وہ اپنی شکایت کا اظہار کرتے وقت، اخلاقی معیارات ہی کا سہارا لیتا ہے۔ انسانوں کا یہ طرزِ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ اخلاقی حسن و قبح کے تصورات محض سماجی معاہدے نہیں ہیں جو اجتماعی مفاد کی خدمت کے لیے استوار کر لیے گئے ہوں بلکہ ان اخلاقی تصورات کی جڑیں، انسان کی فطری ساخت میں پیوست ہیں۔ اس اعتبار سے انسان محض حیوانی وجود یا محض سماجی جان دار نہیں ہے بلکہ اس کے وجود کا اصل جوہر، اخلاقی ہے۔

درست تعبیر

غور سے دیکھیں تو غیب کے منکرین سے انسانی شخصیت اور سماج کو سمجھنے میں لغزش ہوئی ہے۔ وہ انسانوں کے طرزِ عمل کے مشاہدے سے جو نتیجہ نکالتے ہیں، اس کو اِن الفاظ

میں بیان کیا جاسکتا ہے:

''انسانوں کے درمیان تعاون، اشتراکِ عمل اور بقائے باہم کے لیے بعض قدروں کو اپنالیا جانا مفید ثابت ہوا ہے، چنانچہ ان قدروں کو لوگوں نے آفاقی حقیقتوں کا درجہ دے دیا ہے۔''

منکرینِ غیب کا نکالا ہوا مندرجہ بالا نتیجہ، امرِ واقعہ کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ اگر انسان کج فہمی کا شکار نہ ہوتو وہ درجِ بالا موقف کے بجائے، (انسانی سماج کے مشاہدے سے) جو درست نتیجہ اخذ کرے گا، وہ یہ ہوگا:

''انسانی فطرت، وجدانی طور پر نیکی اور بدی نیز حق و باطل کے امتیاز سے واقف ہے۔ چونکہ نیک رویہ، حقیقتِ کائنات اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے، اس لیے جب انسان نیکی کی روش اختیار کرتا ہے تو سماج میں ہم آہنگی اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بدی اور برائی، حقیقتِ کائنات اور فطرتِ انسانی سے ٹکراؤ کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ انسانوں کا براطرزِ عمل، سماج میں انتشار اور فساد پیدا کرتا ہے۔ گویا جو رویہ حقیقت کے مطابق ہے، وہی انسانوں کے لیے مفید بھی ہے۔''

قرآنِ مجید اس جانب اشارہ کرتا ہے:

أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُۥ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ ○ (الرعد:۱۷)

''اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے۔ اور ایسے ہی جھاگ اُن دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنھیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں۔ اس مثال سے اللہ، حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو

جھاگ ہے وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھیر جاتی ہے۔اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔"

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آسمان کی طرف سے بارش اتری جس سے ندی نالے بہ پڑے۔ ہر نالے میں اس کے ظرف اور گنجائش کے موافق، خدا نے جتنا چاہا پانی جاری کر دیا۔ پانی جب زمین پر رواں ہوا تو مٹی اور کوڑا کرکٹ ملنے سے گدلا ہو گیا۔ پھر میل کچیل اور جھاگ پھول کر اوپر آیا۔

اسی طرح تیز آگ میں لوگ چاندی، تانبہ، لوہا اور دوسری معدنیات پگھلاتے ہیں تاکہ زیور، برتن اور ہتھیار وغیرہ تیار کریں۔ اس کام میں بھی اس طرح جھاگ اٹھتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد، خشک یا منتشر ہو کر، جھاگ جاتا رہتا ہے اور جو اصلی کارآمد چیز تھی (یعنی پانی یا پگھلی ہوئی معدنیات) وہی زمین میں باقی رہ جاتی ہے، جس سے مختلف طور پر لوگ منتفع ہوتے ہیں۔ یہی مثال حق و باطل کی سمجھ لو۔

جب وحیِ آسمانی، دینِ حق کو لے کر اترتی ہے تو قلوبِ بنی آدم، اپنے اپنے ظرف اور استعداد کے موافق فیض حاصل کرتے ہیں۔ پھر حق اور باطل، باہم بھڑ جاتے ہیں تو میل ابھر آتا ہے۔ بظاہر باطل، جھاگ کی طرح، حق کو دبا لیتا ہے لیکن اس کا یہ اُبال عارضی اور بے بنیاد ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کے جوش و خروش کا پتہ نہیں رہتا، خدا جانے کِدھر گیا۔ جو اصلی اور کارآمد چیز، جھاگ کے نیچے دبی ہوئی تھی (یعنی حق و صداقت) بس وہی باقی رہ جاتی ہے۔"

یہاں قرآنِ مجید نے حق کے نافع ہونے کی طرف (اور باطل کے غیر نافع ہونے کی طرف) اشارہ کیا ہے۔ حق اور باطل کا امتیاز، زندگی اور معاملاتِ زندگی کے ہر گوشے میں کیا جانا چاہیے۔ اس قرآنی طرزِ فکر کے مطابق جب انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو پر غور کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وحیِ الٰہی پر مبنی اخلاقی تعلیمات، محض اس بنا پر واجب التعمیل نہیں ہیں کہ اُن کے اچھے نتائج، دنیا میں نکلتے ہیں۔ اخلاقی تعلیمات کی سماجی افادیت

تو اُن کے فیض کا صرف ایک جُز ہے۔ محاسنِ اخلاق کو اختیار کرنے کا اصل محرک اُن کا حق و صداقت پر مبنی ہونا ہے۔ جب انسان، انفس و آفاق کے دلائل پر غور کرتا ہے اور وحیِ الٰہی کے لانے والے پیغمبروں کی بے داغ سیرت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے اُن کی دعوت کی صداقت پر یقین حاصل ہوجاتا ہے۔ اس یقین کے نتیجے میں وہ یہ جان لیتا ہے کہ پیغمبروں کے ذریعے لائی گئی تعلیمات حق وصداقت پر مبنی ہیں۔ ان تعلیمات کا ایک اہم شعبہ محاسنِ اخلاق سے متعلق ہے۔ چنانچہ وہ اُن کو اختیار کرتا ہے۔ اس طرح حسنِ اخلاق کا اصل محرک حق پرستی کا جذبہ قرار پاتا ہے۔ داعیانِ حق جو انبیاء کرام کے اُسوے کی پیروی کرتے ہوئے، انسانوں کو درستگیِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، اُن کی اصلاحی مساعی میں حق پرستی کو اساسی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ اخلاقی تلقین کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ درستگیِ اخلاق کا حقیقی محرک ہمیشہ نظروں کے سامنے رہے، تاکہ انسان، رائج الوقت افادی نقطۂ نظر سے متاثر نہ ہو۔

اخلاقی حِس کے علاوہ انسانی شخصیت کا دوسرا اہم پہلو — آزادیِ انتخاب ہے۔ حق و باطل کے درمیان انتخاب کی آزادی، انسان کی اخلاقی حس سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ آزادیِ انتخاب کے انسانی وصف کے سلسلے میں آئندہ روشنی ڈالی جائے گی، ان شاءاللہ!

☆☆☆

آزادیِ عمل اور آزادیِ انتخاب

دینِ حق — اِسلام — نے اِنسانوں پر جو احسانات کیے ہیں اُن میں ایک یہ ہے کہ وہ اِنسانوں کو خود اُن کی فطرت سے آگاہ کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ انسان کا تعارف خود اپنے آپ سے کراتا ہے۔ اس تعارف کے ذیل میں وہ انسانی فطرت کا یہ بنیادی وصف سامنے لاتا ہے کہ اِنسان کو آزادیِ عمل حاصل ہے۔ بلاشبہ اِنسان، طبعی قوانین کے دائرے ہی میں کام کرسکتا ہے لیکن اس دائرے کے اندر عمل کی راہیں اُس پر کھلی ہوئی ہیں۔ وہ مجبورِ محض نہیں ہے، مادی قوتوں کا کھلونا نہیں ہے یا تناسخ کی کسی پُراسرار گردش میں محبوس نہیں ہے بلکہ اپنا آزاد، ارادہ رکھتا ہے اور اِس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خود اپنی قوتوں سے اور کائنات کے وسائل سے کام لے سکتا ہے۔ باشعور ہستی ہونا اور عمل پر قدرت رکھنا، اِنسان کی بنیادی صفات ہیں۔ اِس لیے کسی اِنسان کی آزادیِ عمل پر قدغن لگائی جائے یا اُسے محدود کیا جائے تو وہ سخت پریشانی محسوس کرتا ہے اور پوری کوشش کرتا ہے کہ اُسے عمل کی آزادی دوبارہ مِل جائے۔ اس آزادی کے حصول کے لیے بسا اوقات وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ قربانی کے اِس جذبے کی بنیاد، ہر اِنسان کے وِجدان میں پیوست یہ احساس ہے کہ وہ ایک آزاد ہستی ہے، چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے اپنے شعور کی عائد کردہ بندشوں کے علاوہ اُس کی آزادیِ عمل پر کوئی تحدید نہ ہو۔

شعور اور ارادے کی موجودگی اور عمل پر قدرت کے ساتھ اِنسان میں اخلاقی حِس بھی موجود ہے جو اِنسانی کاموں کے سلسلے میں ایک اہم سوال کا جواب طلب کرتی ہے۔

یعنی ''یہ کام اچھے ہیں یا بُرے؟'' اس سوال کا پس منظر یہ ہے کہ اِنسان کی آزادیِ عمل، زندگی کے ہر موڑ پر عمل کی بہت سی راہیں اُس کے سامنے لاتی ہے۔ اِن راہوں میں انتخاب کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ اس طرح اِنسانی فطرت کے دو نمایاں خصائص کا تعارف کراتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِنسان کو آزادی عمل بھی حاصل ہے اور آزادی انتخاب بھی۔ اِنسانی زندگی کے لیے جو نظریۂ حیات بھی زیرِ غور لایا جائے اُس میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ اِنسان کی آزادی انتخاب کو مجروح نہ کرے۔ اگر اِنسان کی آزادی عمل سلب کر لی جائے یا مفلوج بنا دی جائے اور اسی طرح اگر اپنے کاموں میں اُسے انتخاب کی آزادی حاصل نہ ہو بلکہ وہ کسی خاص راہ کو اختیار کرنے کے لیے مجبور کر دیا جائے تو اس کی اِنسانی شخصیت مجروح ہو جائے گی۔ اُس کی صلاحیتیں ٹھٹھر جائیں گی اور اُن کی نشوونما نہ ہو سکے گی۔ اِسلامی نظریۂ حیات میں فطرتِ اِنسانی کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے تاکہ اِنسانی زندگی وسعتوں سے ہم کنار ہو سکے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آزادیِ عمل پر تحدید کے محرّکات

ہر اِنسان دنیا میں اکیلا آتا ہے اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی وہ تنہا ہوتا ہے۔ حساب کے دِن اللہ کے سامنے اپنی زندگی کے کاموں کی جواب دہی کرتے وقت بھی وہ اکیلا ہی ہوگا۔ لیکن اپنی دنیوی زندگی میں وہ تنہا نہیں ہوتا بلکہ اپنی انفرادی شخصیت کا پورا احساس رکھنے کے باوجود، دوسرے اِنسانوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ دوسرے اِنسانوں کے ساتھ رہنا اُس کی فطرت کا تقاضا ہے اور اُس کی ضرورت بھی۔ واقعتاً اِنسانی نفسیات کی ساخت ایسی ہے کہ اِنسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اِس طرح اُس کی بنیادی ضرورتیں اُسی وقت پوری ہو سکتی ہیں جب اِنسانی معاشرہ اُس کے گرد و پیش موجود ہو اور وہ، اُس معاشرے کا حصہ ہو۔ اِنسان کی تمدنی ترقی کے ساتھ اِنسانی معاشرہ زیادہ منظم ہوتا چلا گیا

ہے اور فرد و معاشرے کے باہمی تعامل نے زیادہ متنوع شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ معاشرے کے اجتماعی اداروں میں ایک کلیدی ادارہ — ریاست ہے جو دوسرے اجتماعی اداروں سے اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ وہ بزورِ قوت بھی افراد سے اپنی بات منوا سکتا ہے جب کہ دوسرے اجتماعی اداروں کو فرد پر اس درجے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ ہے کہ معاشرہ اور ریاست — فرد کی آزادیِ عمل اور آزادی انتخاب پر بندشیں لگاتے ہیں اور تحدیدات عائد کرتے ہیں۔ معاشرے اور ریاست کی تجویز کردہ اِن تحدیدات کے پیچھے، کچھ محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان محرکات میں سے ایک اہم محرّک — نظم وضبط (Law and order) کی برقراری کی خواہش ہے۔ ریاست اکثر اِس لیے افراد کی آزادی عمل وانتخاب کو محدود کرتی ہے کہ امن وامان قائم رہے اور انسانی اختلافات، تصادم کی شکلیں اختیار نہ کرنے پائیں۔ عموماً افراد نے ریاست کی عائد کردہ اِن تحدیدات کو ناگزیر سمجھا ہے اور اِن کی موجودگی پر اعتراض نہیں کیا ہے۔ اکثر اجتماعیات پر غور کرنے والے، اس سلسلے میں صرف اتنا چاہتے رہے ہیں کہ ریاست کی عائد کردہ بندشیں، معقول (REASONABLE) ہوں اور ناگزیر (MINIMUM) حد سے تجاوز نہ کریں۔

اب ریاست کے علاوہ بقیہ اجتماعی اداروں پر غور کیجیے۔ ریاست کے پاس قوتِ قاہرہ (COERCIVE POWER) ہوتی ہے جو دوسرے اجتماعی اداروں کے پاس نہیں ہوتی۔ اس طاقت کے نہ ہونے کے باوجود معاشرے کی روایات اور طور طریقے، عموماً افراد کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور ڈھالے رکھتے ہیں۔ معاشرے کے عام چلن کے خلاف رویہ اختیار کرنا افراد کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ افراد کو اپنا پابند بنائے رکھنے کے لیے جو محرّک — معاشرے کے سامنے ہوتا ہے وہ عافیت پسندی (STATUS QUOISM) ہے۔ معاشرے کے کارفرما عناصر عموماً عافیت پسند ہوتے ہیں اور بحرانی کیفیت (CRISIS) سے ڈرتے ہیں۔ جو ان کے خیال میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرے میں رائج معیارات اور سماج میں مقبول رسوم ورواج — زیرِ بحث آجائیں اور اُن کے بارے میں ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہونے لگیں کہ یہ معیارات وروایات صحیح، مناسب، معقول،

موزوں اور مفید ہیں یا نادرست، غیر مناسب، غیر معقول، ناموزوں اور مضر ہیں۔ بے اطمینانی کی کیفیت سے بچنے کے لیے معاشروں میں یہ رجحان پیدا ہوتا ہے کہ افراد کی آزادی عمل پر (اور آزادی اظہارِ خیال پر) پابندیاں لگائیں۔

ریاست کی یہ خواہش کہ نظم وضبط اور امن وامان باقی رہے اور اسی طرح معاشرے کے بڑوں کی یہ خواہش کہ بحرانی کیفیت پیدا نہ ہو۔ ایسے رجحانات ہیں جنہیں محض مفاد پرستی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن افراد کی آزادی پر تحدید عائد کرنے کے ایسے محرکات بھی ہوتے ہیں جو مفاد پرستی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہر سماج میں ایسے عناصر موجود ہوتے ہیں جو انسانوں کے حقوق سلب کرتے ہیں، لوگوں پر زیادتی کرتے ہیں اور کم زوروں کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسے عناصر کو اقتدار مل جاتا ہے تو وہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے عام اِنسانوں کی آزادیِ عمل اور آزادیِ انتخاب پر نامعقول بندشیں عائد کر دیتے ہیں اور اِس طرح قانون اور نظامِ قانون کو قیامِ عدل کے بجائے ظلم وستم کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔

غور وفکر کے اِس مرحلے پر پہنچ کر ایک اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے:

''کیا ایسی صورت ممکن ہے کہ افراد کو آزادی عمل وآزادی انتخاب حاصل ہو اور نظم وضبط بھی برقرار رہے اور معاشرہ غیر ضروری بحرانی کیفیت سے دوچار نہ ہونے پائے؟''

اِسلام اس سوال کا اطمینان بخش جواب فراہم کرتا ہے۔

شعور اور شخصیت انسانی

مندرجہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے اِسلام دو اہم گوشے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ جہاں تک فرد کی آزادیِ عمل اور آزادی انتخاب کا تعلق ہے، اُس کی ماہیت پر غور کرتے وقت یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ہر فرد کا اپنا شعور لامحالہ اُس کے عمل کو ایک متعین رُخ فراہم کرتا ہے۔ (یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فرد کا ضمیر، اس کی آزادیِ عمل اور آزادیِ انتخاب پر تحدید عائد کرتا ہے) البتہ ضمیر اور شعور کی عائد کردہ یہ بندشیں، چوں کہ خود فرد کے اندرون سے ابھرتی ہیں اس لیے فرد کی آزاد عامل کی حیثیت، اس نوع کی تحدید

سے متاثر نہیں ہوتی۔ اسلام نے اِس بنیادی حقیقت کو کلیدی اہمیت دی ہے۔

غور وفکر کا دوسرا اہم گوشہ یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک، عمل کی بنیاد، ایمان ہے اور ایمان کو شعوری وزندہ ایمان ہونا چاہیے۔ اِنسان کے شعور کو ایمان کی روشنی ملے اور اُس کا ضمیر، ایمان سے توانائی حاصل کرے تو اُس کے عمل کو درست رُخ مِل جاتا ہے۔ اِس طرح اِسلام — اِنسان کے شعور کو اِنسان کی انفرادی شخصیت اور معاشرہ وریاست کے درمیان — ایک موثر واسطے (LINK) کی حیثیت دے دیتا ہے۔ چنانچہ فرد، ایک مجبور اِنسان کی طرح سماج اور ریاست کا جامد جُزنہیں بنتا بلکہ ایک باشعور اِنسان بن کر سماج اور ریاست سے تعلق رکھنے والا موثّر عامل بن جاتا ہے۔ ایمان کی دولت سے مالا مال، باشعور اور باضمیر شخص، سماج کی روایات وچلن کا اندھا مقلّد ہونے کے بجائے اپنے اختیارِ تمیزی سے کام لیتا ہے اور غلط وصحیح میں امتیاز کرتا ہے۔ خیر میں تعاون کے ساتھ وہ پوری وضاحت کے ساتھ یہ موقف سامنے لاتا ہے کہ شر میں تعاون نہیں کیا جاسکتا۔ اِسی طرح وہ نظم وضبط کی برقراری میں ریاست کے اداروں کے رول کو تسلیم کرتا ہے اور اس سلسلے میں اُن کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ لیکن یہ سب اِس لیے کرتا ہے تاکہ زمین میں فساد برپا نہ ہو۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرد کی آزادی کی بحالی کے لیے اسلام کی تجویز کردہ صورت میں، انسانی عمل پر محض وہی تحدیدات عائد ہوتی ہیں جن کے عائد کیے جانے کا مطالبہ، اِنسان کا اپنا شعور اور ضمیر کرتا ہے۔ باقی رہیں بیرونی وخارجی تحدیدات تو اُن میں سے، فرد صرف اُن بندشوں کو، روا سمجھتا ہے جو اُس کے شعور اور ضمیر سے ہم آہنگ ہوں۔ اس صورت میں ریاست کی قوتِ قاہرہ اور معاشرے کی ناروا، روایت پسندی، فرد کی شخصیت اور اُس کی آزادی کو مجروح نہیں کرپاتی۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پا بگِل بھی ہے
انھی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کرلے

ایمان اور شعور

زندہ وحقیقی ایمان حاصل ہو تو انسان کی فکر ونظر میں صالحیت آجاتی ہے اور وہ

اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آجاتا ہے۔قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ (البقرة:۲۵۶،۲۵۷)

''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔اب جو کوئی طاغوت کا اِنکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ (جس کا سہارا اُس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اُن کا حامی ومددگار اللہ ہے اور وہ اُن کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے۔ اور (اس کے برعکس) جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، اُن کے حامی ومددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان لا کر اِنسان غلط خیالات، کج فکری اور انتشارِ فکر کے اندھیروں سے نجات پا لیتا ہے اور ایسی روشنی میں آجاتا ہے جس کی بدولت اُس کے خیالات درست اور حق کے ترجمان ہوجاتے ہیں۔ اُسے راست فکری میسر آتی ہے، اُس کی عقل صحیح نتائج اخذ کرنے کی اہل ہوجاتی ہے اور غلط اور صحیح میں تمیز پر وہ قادر ہوجاتا ہے۔ ایسا انسان معاشرے کی غلط روایات اور جاہلی رسوم سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ معاشرے کو اِن گم راہیوں سے نجات دلانے والا موٴثر عامل بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ایسے انسانی کردار کا تذکرہ کیا گیا ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ

مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (الانعام: ۱۲۲)

''کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا، پھر ہم نے اُسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لیے اسی طرح اُن کے (بُرے) اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔''

یہاں قرآن مجید نے ہدایت سے محرومی کے دور کو، جو ایک انسان پر گزرا، حالتِ موت سے تعبیر کیا ہے۔ جب اُس اِنسان کو اللہ کی توفیق سے ہدایت مل گئی تو وہ مُردہ نہیں رہا بلکہ زندہ ہوگیا۔ یہ باشعور، بیدار ضمیر شخص، اِنسانی معاشرے سے الگ تھلگ نہیں رہتا۔ بلکہ اپنے نور کے ہم راہ وہ اِنسانوں کے درمیان رہتا بستا ہے۔ اُس کی ایمانی کیفیت نے اُسے وہ روشنی بخشی ہے کہ معاشرے کے اندھیرے اُس پر غالب نہیں آنے پاتے۔ اس کے برعکس اُس کے وجود سے اندھیرا مٹنے لگتا ہے اور اُن لوگوں میں جو حق سے محروم تھے، حق شناسی کی اہلیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

یہ اِسلام کا کارنامہ ہے کہ وہ فرد کی آزادی کو محفوظ رکھتے ہوئے اُسے معاشرہ کا کارآمد جُز بناتا ہے۔ باطل سے سمجھوتہ کیے بغیر، معاشرے سے مثبت تعلق کی استواری کا ڈھنگ اِسلام نے سکھایا ہے۔ ریاست کے ظلم کا ساتھ دیے بغیر نظم وضبط کی برقراری کا سبق اِسلام نے دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اِسلام کے علاوہ، دوسرا کوئی نظریۂ حیات اِنسان کی ایسی رہ نمائی نہیں کرتا، جہاں انسان کی آزادی سلب نہ ہو اور وہ معاشرہ و ریاست سے لاتعلق بھی نہ ہو۔ اہلِ ایمان کو دینِ حق کی اس خوبی کی قدر و قیمت کا اِدراک کرنا چاہیے اور عالمِ انسانیت کو اس سے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ اِنسان کو وہ آزادیِ عمل اور آزادیِ انتخاب میسر آسکے، جس کی طلب اُس کی فطرت میں پائی جاتی ہے۔

☆☆☆

جبر کا مقابلہ اور دعوتِ اسلامی

اللہ کی عبادت اور بندگی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ انسان کی فطرت میں خالقِ کائنات کا شکر ادا کرنے اور اس کے آگے سربسجود ہونے کا انتہائی قوی داعیہ موجود ہے۔ اس بنا پر — اگر فطرت مسخ نہ ہوئی ہوتو — ہر انسان اللہ کے آگے جھکنا چاہتا ہے اور اظہارِ بندگی کے لیے مراسمِ عبودیت بجالانا چاہتا ہے۔ انسانی فطرت میں یہ وصف اس لیے ہے کہ نوعِ انسانی کو وجود بخشنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانی ارواح کو خطاب کر کے اپنی بندگی کا عہد لیا تھا۔ اس عہد سے انسانی وجدان آشنا ہے۔ قرآنِ مجید اس امر کا تذکرہ کرتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (الاعراف: ۱۷۲-۱۷۴)

’’اور یاد کرو کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور ان سے اُن کی جانوں کے بارے میں اقرار کرایا۔ پوچھا کہ ’’کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟‘‘ وہ بولے ’’ہاں، آپ ہمارے رب ہیں۔ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں۔‘‘ یہ اس لیے ہوا کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم کو تو اس (یومِ حساب کی آمد) کی خبر نہ تھی۔ یا کہنے لگو کہ شرک کا آغاز تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کیا تھا اور ہم

اُن کے بعد اُن کی اولاد ہوئے تو کیا آپ ہمیں اس کام کی پاداش میں ہلاک کرتے ہیں جو گمراہوں نے کیا تھا۔ اور ہم اس طرح اپنی آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں۔ شاید کہ وہ (حق کی طرف) پلٹ آئیں۔"

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اِن آیات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تمام عقائد حقہ اور ادیانِ سماویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیتِ عامہ پر اعتقاد رکھے۔ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگِ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی اور انبیاء ومرسلین کی ہدایات کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں...... پس ضروری تھا کہ یہ تخمِ ہدایت (جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبدا ومنتہی اور تمام ہدایاتِ ربانیہ کا وجودِ مجمل کہنا چاہیے) عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے، تاکہ ہر آدمی عقل وفہم اور وحی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان وتوحید کے درجے تک پہنچا سکے۔"

اختیار وانتخاب کی آزادی

انسان کی فطرتِ صالحہ کا تقاضا یہ تھا کہ تمام انسان اللہ کی بندگی اختیار کر لیتے۔ لیکن انسان کو اللہ نے آزادی بخشی ہے، چنانچہ نیکی کی طرف انسان کا رجحان ہونے کے باوجود، وہ بدی کی راہ اختیار کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ انسان کا نفس بھی اسے برائیوں کی طرف مائل کر لیتا ہے اور شیاطین جن وانس بھی اللہ سے بغاوت کی اور گناہوں کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان عوامل کے سبب صورتِ واقعہ عملاً یہ ہے کہ نوعِ انسانی دو گروہوں میں منقسم ہے۔ (الف) اللہ پر ایمان لا کر اس کی بندگی اختیار کرنے والا گروہ اور (ب) کفر کرنے والا گروہ۔ چوں کہ موجودہ زندگی آزمائش ہے، اس لیے یہاں دونوں گروہوں کو مشیتِ الٰہی نے کام کرنے کا موقع دیا ہے۔

قرآنِ مجید ان حقائق کو مختلف پیرایوں میں ہمارے سامنے بیان کرتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَ

تُنۡذِرَ يَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ‌ؕ فَرِيۡقٌ فِى الۡجَـنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِى السَّعِيۡرِ ۝ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَـعَلَهُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰـكِنۡ يُّدۡخِلُ مَنۡ يَّشَآءُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ‌ؕ وَ الظّٰلِمُوۡنَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ۝ (الشوریٰ:۷-۸)

''ہم نے اسی طرح یہ قرآنِ عربی تمہاری طرف وحی کیا ہے، تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہرِ مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو اور جمع ہونے کے دن سے ڈرا دو جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں۔ اگر اللہ چاہتا تو (انسانوں کو اختیار کی آزادی نہ دیتا اور) ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔''

هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّمِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۝ (التغابن:۲)

''وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن۔ اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔''

تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَـقِّ‌ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝ تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ‌ۘ مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ‌ؕ وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ وَاَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ وَلٰـكِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ ۝ (البقرۃ ۲۵۲-۲۵۳)

''یہ اللہ کی آیات ہیں، جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں، اور اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تم یقیناً اُن لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہم کلام ہوا، کسی کو

اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے، اور (آخر میں) عیسیٰ ابنِ مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روحِ پاک سے اُس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو (انسانوں کو اختیار کی آزادی نہ دیتا پھر) ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے۔ مگر (اللہ کی مشیت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے، اس وجہ سے) انھوں نے باہم اختلاف کیا، پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں، اللہ چاہتا، تو وہ ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

جابروں کے آگے جھکنے سے انکار

تاریخ بتاتی ہے کہ انسانوں میں سے جن لوگوں نے حق کو چھوڑ کر گم راہی اختیار کی وہ اکثر وبیش تر محض خود گم راہ ہونے پر قانع نہ رہے بلکہ انھوں نے پیروانِ حق کو بہکانے کی کوشش بھی کی۔ اس کے لیے فریب، تحریص اور تخویف کے علاوہ انھوں نے جبر اور زبردستی کا راستہ بھی اختیار کیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کی بنا پر وہ ایمان نہ لائے تھے تو کم سے کم دوسروں کو حق کے راستے سے نہ روکتے۔ لیکن انھوں نے ظلم و جبر کے ذریعے اہلِ ایمان کو کفر پر مجبور کرنا چاہا، خاص طور پر وہ منکرینِ حق، جو کسی نہ کسی نوعیت کا اقتدار رکھتے تھے، پیہم یہ کوشش کرتے رہے کہ طاقت کے زور سے ایمان لانے والوں کو کفر پر آمادہ کریں، ایسے حالات میں اہلِ ایمان کیا کریں، اس سلسلے میں فرعون کے واقعے سے رہ نمائی ملتی ہے۔

فرعون نے اپنی مملکت کے ماہر جادوگروں کو جمع کیا، تاکہ موسیٰ علیہ السلام نے عصا کا جو معجزہ دکھایا تھا، اس کو شکست دی جا سکے۔ لیکن ہوا یہ کہ مقابلے کے بعد جادوگروں نے سمجھ لیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا کوئی جادوئی شے نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اللہ کی نشانی ہے اور موسیٰ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جادوگر فوراً موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اس واقعے پر فرعون کا ردِ عمل یہ تھا کہ اس نے سخت عذاب کی دھمکی

دے کر اُن کو ایمان سے پھیرنے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس مملکت میں میری مرضی چلے گی۔ میری اجازت کے بغیر کسی کو جرأت نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئے:

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○ رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ○ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ○ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ○ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ○ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۚ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ○ (الاعراف:۱۲۱-۱۲۶)

''جادوگروں نے کہا: ہم نے مان لیا رب العالمین کو، اس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون مانتے ہیں۔ فرعون نے کہا: ''تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں؟ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کردو۔ اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمھیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔'' ایمان لانے والوں نے جواب دیا: ''بہرحال پلٹنا ہمیں اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انھیں مان لیا۔ اے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔''

فرعون اور ایمان لانے والوں کے درمیان اس گفتگو کے ذریعے، رہتی دنیا تک ایمان لانے والوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ جباروں کے آگے نہ جھکیں، بلکہ ایمان پر قائم رہیں خواہ کتنی ہی سخت آزمائشیں پیش آئیں۔ بالآخر سب کو اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے، اُن کو بھی جو حکومت و اقتدار کے بل پر ظلم کر رہے ہیں اور زبردستی انسانوں کو خدا پرستی سے

روک رہے ہیں۔ اور اُن کو بھی جو اللہ کے راستے میں تکلیفیں برداشت کررہے ہیں۔ آخرت میں ان سب کے درمیان فیصلہ کردیا جائے گا۔

فرعون کا واقعہ، حق و باطل کی کشمکش کی ایک مثال ہے۔ قرآن مجید اللہ کے رسولوں کی دعوت کا انکار کرنے والے سردارانِ قوم کے عام رویے کا ذکر بھی کرتا ہے۔ دعوتِ حق کے منکر سرداروں نے رسولوں کو ملک سے باہر نکال دینے کی دھمکی دی۔ اس کے جواب میں اُن کو بتایا گیا کہ اللہ کا عذاب، ظلم کرنے والوں کو ہلاک کردے گا:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝

(ابراہیم: ۱۳، ۱۴)

''آخر حق کا انکار کرنے والوں نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا، ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے۔ تب اُن کے رب نے اُن پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کردیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔ یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔''

مندرجہ بالا گفتگو میں منکرینِ حق کی اس دھمکی کا ذکر ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو ''اپنے ملک'' سے نکال دیں گے۔ ایک دوسرے موقع پر قرآن مجید جباروں کی اس غلط فہمی کو رفع کرتا ہے کہ ملک ان کا ہے:

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (الاعراف: ۱۲۸)

''موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد مانگو اور (حق پر) جمے رہو۔ (جان لو کہ) زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور آخری کام یابی انہی کے لیے ہے، جو اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔''

یہاں موسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے والوں اور کفر کرنے والوں، دونوں کو یہ حقیقت یاد دلائی ہے کہ ملک کے حقیقی مالک وہ افراد یا گروہ نہیں ہیں، جن کو اس وقت (مشیتِ الٰہی کے تحت، ایک عارضی مدت کے لیے) حکومت ملی ہوئی ہے۔ بلکہ حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ جب چاہتا ہے، ملک کے عارضی اقتدار کو ایک فرد یا گروہ سے لے کر دوسرے فرد یا گروہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ جب صورتِ واقعہ یہ ہے کہ تو ان عارضی اہلِ حکومت کو یہ اختیار کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ملک کو اپنی ملکیت بتائیں اور الٹا ان لوگوں کو نکالنے کے درپے ہوں جو حقیقی مالک الملک کی بندگی کرنا چاہتے ہوں۔

اہلِ ایمان اور جباروں کی کشمکش کی ایک اور مثال شعیب علیہ السلام کے واقعے میں سامنے آتی ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝ (الاعراف: ۸۸-۸۹)

”شعیب کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ اے شعیب! ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔ شعیبؑ نے جواب دیا: کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لیے تو اس (ملتِ کفر) کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں۔ الا یہ کہ خدا، ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اسی پر ہم نے اعتماد کر لیا۔ اے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔“

مندرجہ بالا گفتگو میں شعیب علیہ السلام نے ظالموں کے مطالبے کو ماننے سے صاف انکار کر دیا ہے اور یہ بات واضح کر دی ہے کہ ملتِ کفر کی طرف لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزید برآں انبیاء علیہم السلام کی سرگزشت سے عام اصول معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرنے والوں کی بات نہ ماننے کی تلقین نبیوں کی دعوت کا اہم جز رہی ہے:

فَاتَّقُوا اللهَ وَ أَطِيعُونِ○ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ○ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ○ (الشعراء:۱۵۰-۱۵۲)

''(صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو، جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔''

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ أَمْرُهٗ فُرُطًا○ (الکهف:۲۸)

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں، اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریقِ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔''

جبر کے مقابلے کا طریقِ کار

انبیائی دعوت کے مندرجہ بالا نمونوں سے وہ طریقِ کار سامنے آجاتا ہے جو جبر کے مقابلے کے لیے نبیوں نے اختیار کیا۔ اہلِ حق اور اہلِ باطل کی کشمکش ۔نظریاتی اور عملی ۔ دونوں میدانوں میں ہوتی ہے۔ نظریاتی میدان میں اہلِ حق کی فتح کے لیے یہ ضروری ہے کہ دعوتِ اسلامی کی حقانیت کے دلائل، اہلِ ایمان پر ہمیشہ واضح رہیں۔ دوسری جانب یہ بھی

ناگزیر ہے کہ باطل کی طرف سے جو پُرفریب باتیں کہی جارہی ہوں، اُن کی حقیقت اہلِ ایمان پر آشکارا ہو اور وہ فریب کا پردہ چاک کر کے حقائق کو اُن کے اصل رنگ میں دیکھ سکیں۔

جبر کے مقابلے کے لیے درجِ ذیل نکات پر مشتمل طریقہ، انبیاء علیہم السلام اور اُن کے ساتھیوں نے اختیار کیا:

(الف) ہر قسم کے حالات میں بے لاگ دعوتِ حق، انسانوں کے سامنے پیش کی جاتی رہی۔ غلط کو غلط کہنے اور صحیح کو صحیح قرار دینے سے کوئی جابرانہ اقدام، اہلِ حق کو باز نہ رکھ سکا۔

(ب) اہلِ باطل نے اپنے رویے کے جواز میں جو باتیں کہیں، اُن کی نامعقولیت کو واضح کیا گیا۔ مثلاً ان کے اس دعوے کی تردید کی گئی کہ ملک ان کا ہے اور انھیں اختیار حاصل ہے کہ اہلِ ایمان کو اپنے ملک سے نکال دیں۔ اُن کو بتایا گیا کہ ملک تمہارا نہیں ہے، بلکہ اللہ کا ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے، اقتدار بخشتا ہے۔ جس فرد یا گروہ کو اقتدار ملا ہو اس کو چاہیے کہ اپنی طاقت کو انصاف کے قیام کے لیے استعمال کرے اور انسانوں پر جبر و ظلم سے باز رہے۔

(ج) اہلِ ایمان نے صبر اختیار کیا یعنی حق پر جمے رہے۔ ایمان کے اعلان سے کسی حال میں باز نہیں آئے اور مشکلات کے علی الرغم، ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی بھر پور کوشش کرتے رہے۔

(د) اہلِ ایمان نے ایک دوسرے کو سہارا دیا اور دعوتِ حق، شہادت علی الناس اور دین پر عمل کے سلسلے میں ایک دوسرے کی مدد کی۔ جو صاحبِ ایمان آزمائش میں گرفتار ہوا، اس نے اپنے آپ کو اکیلا نہیں پایا، بلکہ بہت سے اہلِ حق نے اس کو تسلی اور بشارت دی۔ اس کے حق میں دعائیں کیں، اسے راہیں سجھائیں اور مشورے دیے۔ ان سب کے علاوہ آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے عملی تعاون بھی کیا۔ اس کو ظلم سے بچانے کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ اس کو تکلیفوں سے محفوظ رکھنے اور اس کی ضرورتوں کو پوری کرنے کے لیے اپنا وقت، توانائی اور مال خرچ کیا۔

جبر کے مقابلے کا یہ وہ طریقِ کار ہے جو داعی حق گروہ کے شایانِ شان ہے۔ اہلِ حق کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ظلم و جبر کے مقابلے کے لیے وہ طریقے اختیار کریں جو رنگ و نسل کی بنیاد پر بننے والے گروہ اختیار کیا کرتے ہیں۔ آج پوری دنیا میں امتِ مسلمہ کو جابرانہ اقدامات سے واسطہ پیش آ رہا ہے۔ افرادِ امت کو اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ اس مخالف ماحول سے مقابلے کے لیے انھوں نے کون سا طریقہ اختیار کر رکھا ہے، کیا وہ اسوۂ انبیاء کی پیروی کر رہے ہیں یا حق سے غافل دنیا کے طریقوں کو انھوں نے اپنا لیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ کام یابی، اسوہ انبیاء کی پیروی میں ہے چاہے جبر کے خاتمے میں دیر لگے۔ اس کے برعکس جادۂ حق سے ہٹ کر جو کوششیں جبر کے مقابلے کے لیے کی جائیں گی، وہ دعوتِ حق کی راہ کو کھوٹی کر دیں گی۔ یہ ایسا نقصان ہوگا جس کی تلافی، اس ظاہری امن و امان سے نہ ہو سکے گی، جو باطل سے ہم آہنگی اختیار کر کے حاصل کیا گیا ہو۔

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

☆☆☆

دعوتِ اسلامی کے نکات اور طریقِ کار

دعوتِ اسلامی کے معنی انسانوں کو اللہ کی طرف بلانے کے ہیں۔ کارِ دعوت، انبیاء علیہم السلام کے اسوے کا بنیادی عنصر ہے اور اہلِ ایمان کی منصبی ذمہ داری بھی ہے۔ قرآنِ مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے ہوئے آپ کو داعی الی اللہ قرار دیا گیا ہے:

يَآيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

''اے نبیؐ! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔''

ایک موقع پر جنوں میں سے بعض افراد نے قرآنِ مجید سنا اور پھر دوسرے جنوں سے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو داعی الی اللہ کے الفاظ سے موسوم کیا:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (الاحقاف: ۲۹-۳۱)

''(اور وہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف لے آئے تھے تا کہ وہ قرآن سنیں۔ جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انھوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ

(جن) خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انھوں نے جا کر کہا:

''اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہ نمائی کرتی ہے حق اور راہِ راست کی طرف۔ اے ہماری قوم کے لوگو! 'داعی الی اللہ' کی دعوت قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تمھیں عذاب الیم سے بچادے گا۔''

انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرتے ہوئے اہلِ ایمان بھی دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اُن کے موقف کو قرآن مجید بہترین موقف قرار دیتا ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ○ (حٰم السجدہ: ۳۳)

''اور اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔''

دعوتِ اسلامی کے موضوع پر غور کرتے وقت چند اہم سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں:

(الف) دعوتِ اسلامی کے نکات کیا ہیں؟

(ب) کارِ دعوت کے لیے کیا تیاری درکار ہے؟

(ج) دعوت کے مخاطب کون ہیں یعنی داعی کس کو خطاب کرے؟

(د) دعوت کا طریقہ کیا ہے اور دعوت کے لیے کیا اسلوب اختیار کرنا چاہیے؟

(ہ) داعی کو کس ترتیب کے ساتھ اپنا پیغام پیش کرنا چاہیے؟

(و) دعوت کی راہ کے متوقع مراحل کیا ہیں؟ مخاطبین کے مثبت یا منفی ردِعمل کے سلسلے میں داعی کو کیا رویہ اختیار کرنا ہوگا؟

(ز) اقامتِ دین کے وسیع اور متنوع تقاضوں اور کارِ دعوت کے مابین کیا تعلق ہے؟

ان تمام سوالات پر تفصیلی گفتگو کا تو موقع نہیں البتہ اجمالاً ان سے تعرض ضروری

ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جب حالات وظروف بدلتے ہیں تو نئے چیلنجز سامنے آتے ہیں۔ کسی ایک زمانے میں بھی خطہ ارضی پر رہنے والے مختلف انسانی گروہوں کے حالات یکساں نہیں ہوتے چنانچہ ان سے دعوتی مخاطبت میں اس تنوع کا لحاظ ضروری ہے۔ اسی طرح زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ٹکنالوجی، وسائل کے استعمال کے طریقوں اور ابلاغ کے ذرائع میں تبدیلی آتی ہے۔ انسانوں سے خطاب کرنے کے اسلوب پر اس تبدیلی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ خارج کی ان تبدیلیوں کے علاوہ انسانی گروہوں کے مزاج اور نفسیات میں پائے جانے والے تنوع اور اُن کے داخل کی دنیا میں واقع ہونے والے تغیرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ درج بالا سوالات کے سیاق میں کوشش کی جائے گی کہ دعوتِ اسلامی سے متعلق غور طلب مختلف موضوعات کا جائزہ لیا جائے، اُن امور کی نشان دہی کی جائے جن میں حالات و ظروف کے تغیر کی بنا پر تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اُن امور کی بھی، جن میں حالات کا تغیر، نئی تفہیم وتعبیر اور تخلیقی کاوش کا تقاضا کرتا ہے۔

دعوتِ اسلامی کے نکات

قرآنِ مجید نے متعدد آیات میں دعوت اسلامی کے نکات کو بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر درجِ ذیل آیات پر غور کیا جاسکتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

(النحل: ۳۶)

”بے شک ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔“

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ○ (الکہف: ۱۱۰)

”اے نبیؐ! کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ

تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رَب کی ملاقات کا امیدوار ہو اُسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔"

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ (الانبیاء:۲۵)

"ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔"

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (المومنون:۲۳)

"ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟"

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ○
(طٰہٰ:۴۷)

"اللہ نے (موسیٰ اور ہارون سے) کہا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم تیرے رَب کے رسول ہیں، پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور اُن کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔"

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ○ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ○ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ (الشعراء:۱۲۴-۱۳۱)

"یاد کرو جب کہ اُن کے (یعنی قومِ عاد کے) بھائی ہود نے اُن سے کہا تھا: کیا تم

ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمّہ ہے۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر ایک یادگار عمارت بناڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بن کر ڈالتے ہو۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ○ۚ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ○ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ○ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ○ (الشعراء: ۱۴۱-۱۵۲)

''ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ اُن کے بھائی صالح نے اُن سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں، بس یونہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ اُن میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔''

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ الْمُرْسَلِيْنَ ○ۚ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَتَاْتُوْنَ

الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ○ (الشعراء:۱۶۰-۱۶۶)

''لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ اُن کے بھائی لوط نے اُن سے کہا تھا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے، مَردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے، اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو۔''

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ○ ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ○ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ○ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ○ (الشعراء:۱۷۶-۱۸۴)

''ایکہ والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب شعیب نے اُن سے کہا تھا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اس ہستی کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گزشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔''

آیاتِ بالا سے دعوتِ اسلامی کے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

(i) اللہ کی بندگی کی جائے اور طاغوت سے بچا جائے۔

(ii) رسالت اور آخرت کو مانا جائے۔

(iii) نیک عمل کیا جائے اور اللہ کے ساتھ کسی شریک نہ کیا جائے۔
(iv) اللہ کا تقویٰ اختیار کیا جائے اور اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔

ان بنیادی نکات پر مبنی دعوت کے علاوہ، اللہ کے بھیجے ہوئے رسول چند اور اہم امور کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ مثلاً:

(i) ظلم اور جبّاری سے اجتناب کی نصیحت۔
(ii) آخرت سے غافل کرنے والی غیر ضروری تعمیر سے پرہیز کی تلقین۔
(iii) اللہ کے باغیوں کی اطاعت نہ کرنے کی دعوت۔
(iv) بے حیائی کے کاموں اور خلافِ فطرت حرکتوں سے باز آنے کی نصیحت۔
(v) پیمانے اور ترازو درست رکھنے کی تلقین۔
(vi) زمین میں فساد نہ پھیلانے کی نصیحت۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حالات میں اسلام کے داعی، دعوت کے ذیل میں کن نکات کو بیان کریں؟ ظاہر ہے کہ بنیادی نکات کے سلسلے میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ آج بھی اللہ کی بندگی، طاغوت سے اجتناب، رسولوں پر ایمان، آخرت پر یقین، شرک سے پرہیز، عمل صالح کے اہتمام، تقویٰ کے التزام اور رسول کی اطاعت کی دعوت دی جائے گی۔ البتہ یہ ضروری ہوگا کہ موجودہ دور میں وجودِ باری تعالیٰ اور عقل و وحی کے تعلق جیسے موضوعات کے سلسلے میں جو نئے سوالات پیدا ہو گئے ہیں، اُن کا جواب بھی فراہم کیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ عملِ صالح اور تقویٰ کے التزام کے وہ تقاضے واضح کیے جائیں جو زندگی کے تمام گوشوں سے متعلق ہیں اور جن کی طرف عموماً لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔

دعوت کے بنیادی نکات کے بعد، دعوت کے ان پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے جن کا تعلق فضائلِ اخلاق کی تلقین، رذائل سے بچنے کی تاکید، ظلم اور فساد سے اجتناب کی دعوت اور حقوق العباد کی ادائیگی کی نصیحت سے ہے۔ اصولاً یہ سارے امور، آج بھی دعوتِ اسلامی کا جز ہوں گے۔ البتہ یہ ضروری ہوگا کہ آج کے انسانی معاشرہ کا جائزہ لیا جائے، وہ جن نمایاں اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہے، اُن کی واضح نشان دہی کی جائے۔ اسی طرح حقوق العباد

کے وہ تقاضے جو نظروں سے اوجھل ہیں، سامنے لائے جائیں۔ ظلم اور فساد نے آج نئی شکلیں اختیار کر لی ہیں، اُن کے بارے میں انسانوں کے شعور کو بیدار کرنا ضروری ہے۔ پھر اُن سے بچنے کی نصیحت کی جانی چاہیے۔

کارِ دعوت کی تیاری

اللہ کی طرف بلانے کا عظیم الشان کام تیاری چاہتا ہے۔ اس تیاری کا ایک پہلو یہ ہے کہ دعوت دینے والا پہلے قرآن مجید کے پیغام کی روح کو اپنے اندر جذب کرے۔ قرآن مجید میں ہے:

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ○ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ○ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ○ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ○ (المزمل: ۲-۶)

''رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات یا اُس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔''

ظاہر ہے کہ نصف رات کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اور اس میں قرآنِ مجید کی تلاوت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ بعد میں اس ہدایت میں تخفیف کر دی گئی اور یہ کہا گیا کہ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے، پڑھ لو۔ لیکن جہاں تک اس ہدایت کی اصل اسپرٹ کا تعلق ہے وہ بدستور قائم ہے۔ یعنی قرآن مجید کو رات کی نماز میں پڑھا جائے، ٹھیر ٹھیر کر پڑھا جائے اور قلب و ذہن کو اس کے نور سے منور کیا جائے۔ اس تیاری کے بعد ہی اللہ کی طرف بلانے کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

سورۂ مزمل کی آخری آیت میں مذکورہ بالا تخفیف کا تذکرہ ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ

تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (المزمل:۲۰)

''اے نبیؐ! تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات، عبادت میں کھڑے رہتے ہو اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی۔ اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو، پڑھ لیا کرو۔ اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کریں گے اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے۔ پس جتنا قرآن، آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔''

رات کی نماز میں قیام اور قرآن مجید کی تلاوت سے قلبِ انسانی کی اصلاح ہوتی ہے۔ یہ دعوت کی تیاری کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا اہم پہلو علمی تیاری کا ہے یعنی دعوت دینے والے کو اس دین سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے جس کی طرف انسانوں کو بلانا مقصود ہے۔ اس کو جاننا چاہیے کہ دین کیا ہے؟ اس کی تعلیمات کیا ہیں؟ ان تعلیمات کے پیچھے کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ اور اسلام اپنے پیغام کی صداقت کے حق میں کیا دلائل پیش کرتا ہے؟ اس تیاری کے معنی یہ ہیں کہ دین کا گہرا فہم حاصل کیا جائے۔ قرآن مجید نے اس کا تذکرہ کیا ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ

لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ○ (التوبہ:۱۲۲)

''اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔''

اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اگر سارے اہلِ ایمان، دین کا گہرا فہم حاصل نہ کرسکیں تو کم از کم کچھ لوگ تو ضرور ایسا کریں اور اس کے بعد وہ اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کی صحیح رہنمائی کا فریضہ — دینی بصیرت کی روشنی میں — انجام دیں۔ حالات کی تبدیلی کے باوجود دعوت کی تیاری کی اہمیت حسبِ سابق باقی ہے۔

دعوت کے مخاطب

اصولاً دعوتِ اسلامی کے مخاطب تمام انسان ہیں۔ قرآن مجید میں تمام انسانوں سے خطاب پر مشتمل متعدد آیات موجود ہیں۔ مثلاً:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○ (البقرۃ:۲۱)

''اے انسانو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے۔ تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔''

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ○

(الاعراف:۱۵۸)

''(اے نبیؐ!) کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اُس خدا کا رسول ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبیِ امّی پر، جو

اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے۔ اور پیروی اختیار کرو رسول کی۔ امید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔"

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○

(الحجرات: ۱۳)

"اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہارے قبیلے اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار (متقی) ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

اسلام کے اس عالم گیر خطاب کی ضرورت آج بھی اسی طرح ہے، جیسے نزولِ قرآن کے وقت تھی چنانچہ اہلِ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ ساری انسانیت کو خطاب کریں اور اُن تک حق کا پیغام پہنچائیں۔ آج کے دور میں یہ کام، ماضی کے مقابلے میں آسان ہو گیا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جو انسان ہم سے قریب ہوں اُن سے ربط قائم کرنا اور گفتگو کرنا آسان ہوتا ہے۔ ہمسائیگی کی بِنا پر اُن کا حق بھی زیادہ ہے، اس لیے خطاب کی عالم گیر نوعیت کے باوجود اُن افراد اور گروہوں سے ترجیحاً ربط قائم کرنا چاہیے جو علاقے اور زبان کی یکسانیت کی بنا پر یا کسی اور سبب سے داعی کے قریب ہوں۔ ہر اہم کام کی طرح کارِ دعوت بھی منصوبہ بندی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس منصوبہ بندی میں اُن افراد پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے جن سے کسی نوعیت کی قربت موجود ہو۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح صحیح ہے جس طرح ماضی میں صحیح تھا۔

دعوت اسلامی کے خطاب کی ہمہ گیری یہ تقاضا کرتی ہے کہ حق کی طرف بلانے والے ہر انسان کو اہمیت دیں، بحیثیت انسان اُس کا احترام کریں، اُس کے حقوق کی ادائیگی کی فکر کریں، اس کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہوں، اس کو اپنی اصلاح اور اپنی شخصیت کے ارتقا کی طرف متوجہ کریں، فکر و عمل کی گم راہی اور کج روی سے اُس کو بچائیں،

حق وصداقت کی راہ اس کے سامنے نمایاں کریں اور ربِ حقیقی سے اس کا تعارف کرائیں۔ کوئی انسان کم زور ہو یا قوی، غریب ہو یا امیر، خواندہ ہو یا ناخواندہ، مرد ہو یا عورت، دیہاتی ہو یا شہری، بظاہر زیادہ صلاحیت رکھتا ہو یا کم صلاحیت کا حامل ہو، بہر حال داعیِ حق کی توجہ کا مستحق ہے اور اس کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہے۔ ابتدائی خطاب کے بعد البتہ داعی یہ جائزہ لے سکتا ہے کہ وہ افراد کون سے ہیں، جو سنجیدگی اور شوق کے ساتھ پیغامِ حق کو سُن رہے ہیں اور وہ کون ہیں جو بے پروا اور بے نیاز ہیں۔ اس جائزے کی روشنی میں متلاشیانِ حق کو زیادہ اہمیت دینا صحیح ہوگا۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ (الکہف:۲۸)

”اے نبیؐ! اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح وشام اسے پکارتے ہیں، اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت کو پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریقِ کار افراط اور تفریط پر مبنی ہے۔“

طریقِ دعوت

دعوت کے نکات کی تفہیم کے بعد یہ ضروری ہے کہ دعوت کے طریقے پر توجہ دی جائے۔ اس سلسلے میں قرآنِ مجید نے اصولی رہ نمائی فراہم کی ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ

عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ○ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ○ (النحل:۱۲۵-۱۲۸)

''اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ اے نبیؐ! صبر سے کام کیے جاؤ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے، جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان کی روش اختیار کرتے ہیں۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اُس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔''

'حکمت' کے ذیل میں مولانا مودودیؒ نے ان نکات کو شامل کیا ہے:

(۱) مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کا اندازہ

(۲) مخاطب کے مرض کی تشخیص

(۳) مرض کا علاج کرنے کے لیے مناسب دلائل کے ساتھ گفتگو۔

ظاہر ہے کہ طریقِ دعوت کا یہ جز، حالات کے ساتھ بدلتا رہے گا۔ اگر حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں مخاطب فرد یا گروہ کی کیفیت بدل جائے تو نئی کیفیت کے مطابق، اس

سے گفتگو کرنی ہوگی۔ اس نئے اسلوب کی درست نشان دہی کے لیے حالات کا صحیح فہم درکار ہے اور دین کی گہری سمجھ بھی ضروری ہے۔ اصولی طور پر دعوت کے طریقِ کار کے سلسلے میں اجمالی رہ نمائی یوں کی جاسکتی ہے کہ ''اسلوبِ دعوت حکیمانہ ہونا چاہیے'' لیکن کسی متعین مخاطب کے اعتبار سے حکیمانہ اسلوب کیا ہے، اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے داعی کو محنت کرنی ہوگی۔

مولانا مودودیؒ مزید فرماتے ہیں:

> ''عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفانہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ برائیوں اور گم راہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں اُن (برائیوں) کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی ابھارا جائے اور ان کے برے نتائج کا خوف دلایا جائے۔ ہدایت اور عملِ صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔
> (نصیحت کا) دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذّت لے رہا ہے بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔'' (ایضاً)

دعوت کے طریقِ کار کا یہ جُز، حالات بدلنے سے متاثر نہیں ہوتا۔ ہر قسم کے حالات میں عمدہ نصیحت کی ضرورت باقی رہتی ہے اور اس نصیحت کے مؤثر ہونے کے لیے داعی کی نیک نیتی لازمی شرط ہے۔ دعوت کے طریقِ کار میں جدالِ احسن کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے جدالِ احسن کی اجازت دی ہے۔ اس اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''(جدالِ احسن) کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود، حریف مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجادینا نہ ہو۔ بلکہ اس میں شیریں کلامی

ہو، اعلیٰ درجے کا شریفانہ اخلاق ہو، معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ (مخاطب) کج بحثی پر اُتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گمراہی میں اور زیادہ دور نہ نکل جائے۔''

(تفہیم القرآن، النحل، حاشیہ ۱۲۳)

اس تشریح سے ظاہر ہے کہ مروجہ مناظرہ، جدال احسن کی تعریف میں نہیں آتا۔ تاریخی وجوہ سے اب مناظرے کے ناپسندیدہ طریقوں کا چلن خاصا کم ہوگیا ہے، لیکن جس حد تک باقی ہے اس کی ہمت شکنی کی ضرورت ہے۔ طریقِ گفتگو ایسا ہونا چاہیے کہ مخاطب کے اندر جس حد تک حق پسندی کا جذبہ موجود ہو، وہ فروغ پائے۔ اس کے ساتھ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ جاہلی حمیت کے جذبات مخاطب کے اندر نہ ابھرنے پائیں۔ قرآنِ مجید میں جدالِ احسن کی جو مثالیں موجود ہیں ان کو سامنے رکھا جانا چاہیے۔

دعوت کی ترتیب

قرآنِ مجید میں انبیاء علیہم السلام اور داعیانِ حق کی دعوتی تقاریر کا تذکرہ موجود ہے۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ داعی کو اساسی امور پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے یعنی وہ اللہ اور رسول پر ایمان کی دعوت دے، آخرت کی جواب دہی کا احساس بیدار کرے، فضائلِ اخلاق کی تلقین کرے، معروف کا حکم دے، منکر سے روکے اور حقوق العباد کی ادائیگی کی نصیحت کرے۔ جب مخاطب بنیادی امور کو سمجھ لے تب اس کے سامنے شریعت کی تفصیلات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہی ترتیب انسانی نفسیات کے مطابق ہے۔ جب دلوں میں استعداد اور ذہنوں میں آمادگی پیدا ہوجائے تب عمل کے طریقوں کی تعلیم مفید اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ مخاطب افراد اور گروہوں کے سلسلے میں مندرجہ بالا فطری ترتیب کے علاوہ اُن نکات کا تذکرہ بھی مناسب اور مفید ہے، جو مخاطب کے نزدیک بھی تسلیم شدہ ہوں۔ دعوت کے دیگر پہلوؤں سے ان مسلّمہ نکات کا ربط بآسانی واضح کیا جاسکتا ہے۔ قرآنِ مجید نے اہلِ کتاب کو خطاب کرتے ہوئے مسلمہ حقائق (کلمہ سواء) کا تذکرہ کیا ہے:

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا ٱشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ (آلِ عمران: ۶۴)

''کہو، اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں کوئی، کسی اور کو، اللہ کے علاوہ رب نہ بنائے۔ پس اگر وہ اس بات کو ماننے سے منہ موڑیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان (اللہ کے فرماں بردار) ہیں۔''

مختلف مخاطب گروہوں کے اعتبار سے کلمہ سواء کیا ہے، یہ جاننے کے لیے اس گروہ کے حالات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ حالات کے بدل جانے کی بنا پر ازسرِنو، مطالعے اور تحقیق کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔

متوقع مراحل

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دعوتی جدوجہد، حالات کے فہم اور مناسب منصوبہ بندی کا تقاضا کرتی ہے۔ داعی، پچھلے داعیانِ حق کے تجربات کی روشنی میں یہ اندازہ بھی کر سکتا ہے کہ دعوت کی پیش کش کا ردِعمل کیا ہوگا؟ مخاطب فرد یا گروہ کا ردِعمل کئی قسم کا ہو سکتا ہے:

(۱) مخاطب دعوتِ حق کو قبول کر لے۔

(۲) مخاطب بے پروائی برتے اور دعوتِ حق کو نظر انداز کر دے۔

(۳) مخاطب دل چسپی کا اظہار کرے، اپنے سوالات و اشکالات پیش کرے اور تفصیلات کا طلب گار ہو۔

(۴) مخاطب دعوت کی مخالفت پر اتر آئے اور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرے۔

ماضی کے داعیانِ حق کو ردِعمل کی ان مختلف صورتوں سے سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ آج بھی مندرجہ بالا حالتوں میں سے کوئی حالت پیش آسکتی ہے۔ اسوہ انبیاء کی روشنی میں

داعی اپنا رویہ متعین کرسکتا ہے۔ جولوگ دعوتِ حق کو قبول کرلیں اُن کی تعلیم وتربیت پر توجہ کی جانی چاہیے اور اگر اُن کو آزمائشیں پیش آرہی ہوں تو اُن کی مدد کی جانی چاہیے۔ جو افراد بے پرواہوں اور بے نیازی برتیں، اُن کی اس روش کو بدلنے اور اُن کے اندر سنجیدگی ور احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہ آئے تو ایسے بے نیاز افراد پر مزید وقت صَرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس داعی کے لیے وہ افراد بڑی قدروقیمت رکھتے ہیں جو دعوتِ حق سے دل چسپی لے رہے ہوں اور پیغامِ حق کو سمجھنا چاہتے ہوں۔ داعی کو ان پر توجہ صَرف کرنی چاہیے اور دلائل کی روشنی میں اسلام کی حقانیت اُن پر واضح کرنی چاہیے۔ مخالفین کی مخالفت کے جواب میں ثابت قدمی، صبر اور استقامت سے کام لیا جانا چاہیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس نکتے کی تفصیلات موجود ہیں۔

اقامتِ دین اور کارِ دعوت

یہ حقیقت ملحوظ رہنی چاہیے کہ دعوت کا عظیم کام انجام دینے کی ذمہ داری پوری امتِ مسلمہ پر عائد ہوتی ہے اور فریضۂ دعوت، کارِ اقامتِ دین کا ایک جز ہے۔ اس بنا پر امت کی قیادت کے لیے ضروری ہے کہ دین کی اقامت کے لیے جامع منصوبہ بندی کرے۔ اس منصوبہ بندی کی کام یابی کے لیے امت کے حالات کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ جامع منصوبے کو سلیقے کے ساتھ ترتیب دینے اور روبہ عمل لانے کے لیے منصوبے کے ناگزیر اجزاء کا استحضار ضروری ہے۔ یہ ناگزیر اجزاء، جن پر ہر قسم کے حالات میں توجہ دینی ہوگی، درج ذیل ہیں:

(۱) امتِ مسلمہ کے افراد کی جامع تعلیم وتربیت

(۲) امت کا تحفظ ودفاع اور اس کے مسائل کا حل

(۳) امت کے نظامِ اجتماعی کا احیا اور امت کی ضرورتیں پورا کرنے والے اداروں کی تعمیر

(۴) انسانیت عامہ کو حق کی طرف دعوت

(۵) امت کے اندر اور باہر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(۶) دنیا میں عدل کے قیام کی کوشش

درج بالا سارے امور پر توجہ دی جائے تب اقامتِ دین کے تقاضے پورے کیے جاسکتے ہیں۔ دین کے قیام کے لیے محض دعوتی سرگرمیاں کافی نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا امور کے سلسلے میں عملاً پیش رفت کے لیے دین میں گہری بصیرت حاصل کرنے کے علاوہ موجودہ حالات کو سمجھنا بھی ضروری ہوگا۔ دنیا کے حالات کو بھی اور خود امت کے احوال کو بھی۔ اسی طرح اقامتِ دین کے منشا کو پورا کرنے کے لیے موجودہ سرگرمیوں کے علاوہ نئی راہیں بھی نکالنی ہوں گی، جن میں حالات کے تغیر کے ساتھ، تبدیلی اور ارتقاء کی گنجائش ہوگی۔

☆☆☆

پیغامِ حق کی ترسیل

اِنسانوں تک ہدایت اِلٰہی کی ترسیل کے اعتبار سے انسانی تاریخ کے دو دور قرار پاتے ہیں۔ پہلا دور حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔ تاریخ کے اس مرحلے میں اِنسانوں تک اُن کے خالق و مالک کی ہدایت، اُس کے رسولوں اور پیغمبروں کے ذریعے پہنچتی رہی ہے۔ اِنسانی تاریخ کا دوسرا دور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد سے قیامت تک وسیع ہے۔ اس دور میں اِنسانوں تک پیغامِ ربانی کو پہنچانے کا کام اُمت مسلمہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ تاریخ کے اِن دونوں ادوار میں دینِ حق کی اقامت اور اُس کے مکمل اظہار کا طریقہ ایک ہی رہا ہے، جس کے بنیادی اجزا 'دعوت اور جہاد' ہیں۔ پہلے جز — 'دعوت' — کے اصل ذرائع اِبلاغ اور ترسیل ہیں جن کے لیے اِنسانوں سے ربط ضروری ہے۔ اِبلاغ اور ترسیل کے لیے داعیانِ حق جو کوشش کرتے ہیں اُن میں وہ اُن تمام اسالیب اور وسائل کو استعمال کرتے ہیں جو تمدن کی ترقی نے فراہم کیے ہوں۔ تاہم اس سلسلے میں وہ دعوت اسلامی کے منفرد مزاج کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن کا طریقِ کار، سنجیدہ اور باوقار ہوتا ہے۔ چنانچہ اِبلاغ کے ایسے وسائل وہ اختیار نہیں کرتے جو دعوت کے وقار کے منافی ہوں۔ دعوتِ اسلامی کے مزاج سے ہم آہنگ اِبلاغ کی چند خصوصیات کا تذکرہ ذیل میں کیا جارہا ہے۔

دِلوں پر دستک

قرآن مجید اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے کہ اسلامی دعوت کا مقصود، اِنسانی

قلب وذہن کی تبدیلی ہے تا کہ اِنسان حق کو پہنچان سکے اور اُسے اختیار کر سکے۔ یہ تبدیلی، محکم دلائل کی پیش کش کے ذریعے ہی ممکن ہے، جبر سے اِنسانی قلب تبدیل نہیں ہوتے۔

تسلیم اُسے دِل سے کوئی کرنہیں کرسکتا
وہ ادّعا جوجبر کی تلوار کرے ہے

پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام، اِنسانی شخصیت میں محض کوئی جزوی یا ظاہری تبدیلی نہیں چاہتا بلکہ پورے اِنسانی وجود کو مرضیاتِ الٰہی سے ہم آہنگ بنانا چاہتا ہے۔ایسی ہمہ گیر اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اِنسان کے اندرون کو بدلا جائے۔ اِنسانی اعمال، بہرصورت اُس کے خیالات وافکار کے تابع ہوتے ہیں اور ظاہر کی تبدیلی (اگر وہ حقیقی اور دیرپا ہو) باطن کے تغیر کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔ خیالات وافکار کی دنیا میں انقلاب، جبر کے ذریعے نہیں لایا جاسکتا۔ اِنسان اپنی آزاد مرضی سے جس فکر کو قبول کرتا ہے، وہی اُس کے کردار کی حقیقی بنیاد بنتی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ اِنسان دھوکا کھا سکتا ہے۔ جذباتی اپیل، پُرکشش نعرے اور مسحور کن تقریریں اِنسانوں کو اپنی طرف کھینچ سکتی ہیں اور انہیں حرکت وعمل پر آمادہ بھی کرسکتی ہیں تاہم ایسی سرگرمی کی نوعیت اکثر منفی ہوتی ہے۔استدلال سے خالی اپیل، اِنسانوں سے تخریبی کام تو کرا سکتی ہے لیکن کردار کی تعمیر اُس کے بس کی بات نہیں۔ ماضی کی تاریخ اور حال کی دنیا میں ایسی تحریکات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، جنھوں نے اِنسانوں کو فریب میں مبتلا کیا اور ایک قلیل عرصے کے لیے انہیں سرگرم عمل بھی کر دیا لیکن ایسی تحریکات کے تحت معاشرے کی تعمیر نو کی جانب پیش قدمی نہ ہوسکی۔ اِسلام اور اُس کی دعوت کا مزاج اس سطحیت سے پاک ہے۔ بلاشبہ اسلام، اِنسان کے جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے لیکن اُس کا خطاب، اِنسان کے اعلیٰ اور پاکیزہ جذبات سے ہوتا ہے۔ اسلام کی دعوت، اِنسان کی خوابیدہ فطرت کو بیدار کرتی ہے جب کہ باطل دعوتیں، اِنسان کی فطرت کو سُلانے کی کوشش کرتی ہیں اس لیے کہ بیدار مغز اِنسان، باطل کے خلافِ حقیقت ہونے کا بآسانی اِدراک کرلیتا ہے، اور پھر وہ باطل کے فریب میں نہیں آتا۔

داعیِ حق جانتا ہے کہ مخاطب کے قلب و ذہن کی اِصلاح کے لیے، سنجیدہ ماحول میں اُس سے بات چیت اور گفتگو ضروری ہے۔ اِنسان کے دل کی دنیا اُس وقت بدلنی شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے رَب سے آشنا ہو جاتا ہے اور اس عالمِ واقعہ میں اُس کی نشانیوں کا اِدراک کرنے لگتا ہے۔ داعیِ حق کا کام یہ ہے کہ اِنسانوں کو ربِ حقیقی کی صفات سے واقف کرائے، اُس کی ہدایات سے آگاہ کرے اور اُس کے سامنے جواب دہی کا احساس پیدا کرے۔ اس کام کے لیے موزوں ترین طریقہ انسانوں کے سامنے کلامِ الٰہی کا سُنانا ہے۔ اِنسانوں جب خالق کا کلام سنتے ہیں تو حق کے متلاشی افراد اُس کلام کی صداقت کا بآسانی ادراک کر لیتے ہیں۔

کلامِ الٰہی کو اِنسانوں تک پہنچانے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر عین حالتِ جنگ میں بھی کوئی شخص اللہ کے کلام کو سننے کی خواہش ظاہر کرے تو اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے کہ اسے اس کا موقع فراہم کریں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (التوبہ:۶)

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص، پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تا کہ اللہ کا کلام سنے) تو تم اُسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اُسے اُس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔''

اِبلاغِ عام

سماجی و سیاسی تحریکیں اِبلاغِ عام کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ اس کی وجہ واضح ہے۔ سماج اور اجتماعی اداروں میں کسی قابلِ ذکر تبدیلی کے لیے انقلابی پیغام کی عام ترسیل ایک لازمی شرط ہے۔ اسلام نے بھی اِبلاغِ عام کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اُس کا منشا ہے کہ حق کی دعوت، وسیع پیمانے پر پھیلے اور اِنسانی آبادی کا کوئی گروہ بھی اس دعوت سے ناواقف نہ رہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ دوسری دعوتوں کے برعکس، اسلام کا پیغام کسی مخصوص گروہ

کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اسلام نسل، رنگ، علاقے اور زبان کی تفریق کے باوجود، اِنسانوں کو اُن کی انسانی حیثیت میں خطاب کرتا ہے۔قرآن مجید کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ (البقرۃ:٢١)

''اے اِنسانو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بھی۔ اِس طرح توقع ہے کہ تم بچ سکو گے (غلط بینی، غلط روی اور تباہی سے)۔''

آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک کلیدی ذمہ داری یہ تھی کہ آپ اُمتِ مسلمہ کی تعلیم وتربیت کر کے اُس کو دنیا کی رہ نمائی کے لائق بنا دیں۔ آپ نے یہ فریضہ اپنی پوری نبوی زندگی میں انجام دیا۔ فطری طور پر جن صحابہ کو آپ کی مجالس میں شرکت کے زیادہ مواقع حاصل تھے، انہوں نے اس تعلیم وتربیت سے زیادہ فیض حاصل کیا۔ لیکن اصولاً آپ کی تعلیم، ساری اُمت کے لیے تھی۔ قرآن مجید تزکیہ وتعلیم کے نبوی فرائض کا تذکرہ کرتے ہوئے آئندہ آنے والے اہلِ ایمان کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ حق کے عام اِبلاغ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایک طرف انسانیت عامہ کے درمیان، دعوت کو پھیلانا اور اسلام کا عام تعارف کرانا ضروری ہے وہیں دوسری جانب اُمت مسلمہ کے افراد کی وسیع تعلیم وتربیت کا اہتمام بھی ضروری ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢﴾ وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣﴾ (الجمعہ:٢، ٣)

''وہ اللہ ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اُٹھایا، جو انہیں اُس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گم راہی میں پڑے ہوئے تھے اور (اس رسول

کی بعثت) اُن دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔''

اہلِ ایمان کی آئندہ نسلوں کے اس تذکرے کے ذریعے قرآن مجید نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت کا اہتمام، ہر دور میں جاری رہنا چاہیے تا کہ اہلِ ایمان میں کوئی فرد اور گروہ، دین کی سمجھ سے محروم نہ رہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے دوران بھی یہ طریقہ مسلمانوں کو سکھایا گیا تھا کہ اگر وہ علم کے مرکز (مدینہ) سے دور رہتے ہوں تو اُن کے کچھ نمائندے، مدینہ آکر دین کا فہم حاصل کریں اور پھر اپنی آبادی میں واپس جا کر وہاں کے لوگوں کو تعلیم دیں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (التوبہ:۱۲۲)

''اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تا کہ وہ (غلط روی سے) پرہیز کرتے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بہت سے انبیاء محض اپنی قوم کے لیے بھیجے گئے۔ سارے اِنسانوں تک پیغامِ حق پہنچانے کی ذمہ داری اُن کو نہیں دی گئی۔ تاہم اپنی قوم کے درمیان، انہوں نے قوم کے ہر حصے اور طبقے تک حق کی دعوت پہنچائی اور کسی کو محروم نہیں رکھا۔ اسی بنا پر اکثر ایسا ہوا کہ قوم کے متکبرین نے انبیاء پر اعتراض کیا اور کہا کہ تمہاری مجالس میں پست طبقے کے لوگ موجود ہوتے ہیں اور تمہاری دعوت کے قبول کرنے والے بھی اسی طبقے کے ہیں۔ اس اعتراض کے باوجود، انبیاء علیہم السلام نے اِنسانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی اور حق کی روشنی سے سب کو فائدہ پہنچایا۔ نوح علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ (ہود:٢٧)

''نوح کی قوم کے سرداروں نے ،جنہوں نے اُس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، کہا کہ ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس اُن لوگوں نے جو ہمارے یہاں رذیل تھے، بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو۔ بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔''

نوح علیہ السلام نے متکبر سرداروں کی اس تنقید کے باوجود اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور تمام اِنسانوں تک حق کی ترسیل کا کام جاری رکھا۔ قرآن مجید نے نوح علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے:

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝٢٩ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝٣٠ (ہود٢٩،٣٠)

''نوحؑ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور میں اُن لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے۔ وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دُھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے مجھے کون بچانے آئے گا؟ کیا تم لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی؟''

شخصی گفتگو

اِبلاغِ عام کی اہمیت واضح ہے۔ تاہم تمدن اور ٹکنالوجی کی ترقی کے اعتبار سے لوگ کسی بھی سطح پر ہوں، بہرحال اپنی بات پہنچانے کا مؤثر ترین ذریعہ ایسی گفتگو ہے جو دو

اشخاص کے درمیان روبرو ہو۔ شخصی گفتگو کے اہم امتیازات یہ ہیں:

(الف) جب ایک داعی اپنا پیغام، شخصی گفتگو میں کسی کے سامنے رکھتا ہے تو مخاطب، محض داعی کی بات نہیں سنتا بلکہ اُس کی پوری شخصیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اِس طرح داعی کا اخلاص، اُس کی گرم جوشی اور اُس کے کردار کی بلندی یہ سارے پہلو مخاطب کے سامنے آجاتے ہیں۔

(ب) شخصی گفتگو میں غلط فہمی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ سننے والے کے لیے سوالات کرنے کا موقع ہوتا ہے اور وہ اپنی الجھنیں بیان کرسکتا ہے۔ داعی اُس کے سوالات کے پیش نظر، اپنی بات مزید وضاحت کے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔

(ج) شخصی گفتگو، مخاطب کی اہمیت کا اعتراف ہے۔ جب سننے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کی شخصیت کا احترام کیا جارہا ہے تو وہ پیغام پر سنجیدہ توجہ کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے۔

مندرجہ بالا فوائد اُس وقت بھی حاصل ہوتے ہیں جب ایک فرد کے بجائے، افراد کی ایک مختصر تعداد سے گفتگو کی جائے۔ البتہ جب تعداد بہت بڑھ جائے تو گفتگو کے بجائے تقریر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تقریر کی افادیت کے باوجود، مندرجہ بالا فوائد پورے طور پر تقریر سے حاصل نہیں ہوپاتے۔ ایک فرد یا چند افراد کے بجائے بڑے مجمع سے خطاب کی صورت میں مقرر کے لیے یہ کوشش بہر حال لازم ہے کہ وہ سننے والے ہر فرد کو اپنی دعوت کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔ بسا اوقات سامعین، مجمع کے عام تاثر سے ہم آہنگ ہونے کی غیر شعوری کوشش کرتے ہیں (چنانچہ اگر تقریر پر داد و تحسین کے نعرے بلند ہوں تو سننے والا، مقرر کی بات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے) مقرر کی کوشش کامیاب اُس وقت ہوگی جب وہ سامع کو، مجمع کے تاثرات سے متاثر نہ ہونے دے بلکہ اپنے استدلال سے متاثر کرے۔

شخصی رابطے کی امتیازی خصوصیات کی بنا پر مثالی داعیوں (انبیاء کرام) نے اس طرزِ ترسیل پر توجہ کی ہے۔ انہوں نے افراد سے الگ الگ بھی بات کی اور چند لوگوں سے یکجا گفتگو بھی کی۔ نوح علیہ السلام نے اس کا تذکرہ کیا ہے:

ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸ ثُمَّ اِنِّيْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹ (نوح:۸،۹)

''نوح علیہ السلام نے کہا: ''پھر میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو ہانکے پکارے دعوت دی، پھر میں نے علانیہ بھی اُن کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔''

جب حضرت مصعب بن عمیرؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے بھیجا تو انہوں نے وہاں اسلام کی عام تبلیغ کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے انفرادی ملاقاتیں بھی کیں جن کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ دورِ اوّل کے بعد دنیا کے مختلف مُلکوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ حق کی دعوت قبول کرنے والوں میں ایک قابلِ ذکر تعداد ہمیشہ ایسے افراد کی رہی جو داعیانِ حق سے شخصی گفتگو کے بعد ایمان لائے۔

اِبلاغ کے دیگر ذرائع

اگر شخصی گفتگو کا موقع نہ ہو تو داعی کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ پیغام رسانی کا وہ ڈھنگ اختیار کرے جس میں مخاطب کے لیے بھی کچھ کہنے کا موقع موجود ہو۔ مخاطب چاہے تو سوال کر سکے، وضاحت چاہ سکے اور تنقید کر سکے۔ پچھلے ادوار میں خطوط، پیغام بھیجنے کا ذریعہ تھے۔ جس کو خط لکھا جاتا تھا وہ اپنے جواب میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ اب خطوط کے بجائے ای میل کے ذریعے پیغامات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی مخاطب کی یہ آزادی برقرار رہتی ہے کہ وہ جوابی تاثرات کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس دائرے کو وسیع تر کرتے ہوئے ویب سائٹ (جس میں ردِعمل کے اظہار کی سہولت موجود ہو) اور ویڈیو کانفرنس کو ایسے ذرائع میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ سماجی ذرائع (سوشل میڈیا) کے موجودہ طرز کا بغور جائزہ لے کر اُس میں ضروری اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر افراد کے درمیان بامعنیٰ اور نتیجہ خیز گفتگو کے بجائے محض شور کی کیفیت پیدا ہو جائے تو کسی سنجیدہ پیغام کی ترسیل ممکن نہیں ہوتی۔

بہر صورت داعیانِ حق کو یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ محض معلومات کا بہم پہنچانا اُن

کا مقصد نہیں۔ بلکہ انسانوں کے قلب و ذہن اور شخصیت و کردار کی تبدیلی اُن کا ہدف ہے۔ چنانچہ سماجی ذرائع سے روابط قائم ہونے کے بعد، دعوت سے دل چسپی لینے والوں سے ملاقات کا اہتمام ہونا چاہیے تا کہ راہِ حق کی طرف اُن کی پیش قدمی ممکن ہو سکے۔ اِبلاغِ عام کے وسیع دائرے میں شخصی روابط کے لیے موزوں افراد کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

اِبلاغ کے الیکٹرانک ذرائع کی دست یابی کے باوجود، ترسیل کے قدیم وسائل کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ چنانچہ آج بھی پیغام رسانی اور درست معلومات کی فراہمی کے لیے کتابوں، کتابچوں، فولڈرز، اخبارات اور رسائل وجرائد کی اہمیت وافادیت مسلّم ہے۔ جس طرح سامع کو اظہارِ خیال کا موقع دینا، پیغام رسانی کو نتیجہ خیز بناتا ہے اسی طرح قاری کو سوالات کرنے اور تاثرات بیان کرنے کا موقع فراہم کرنا بھی درست تفہیم کے لیے مفید ہوتا ہے۔ رسائل وجرائد اور اخبارات میں قارئین کے سوالات اور آراء کے کالم کی موجودگی، ترسیل میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ سوالات اور آراء کے جواب میں وضاحتیں فراہم کی جانی چاہئیں۔

ترسیل و اِبلاغ کے سلسلے میں مندرجہ بالا نکات کا خلاصہ یہ ہے:

(الف) پیغام رسانی کا مؤثر ترین ذریعہ آج بھی وہ گفتگو ہے جو ایک فرد یا چند افراد سے کی جائے۔

(ب) مختصر مجمع سے خطاب کی صورت میں سوالات اور اظہارِ خیال کے مواقع بآسانی فراہم کیے جا سکتے ہیں اور کیے جانے چاہئیں۔

(ج) قدیم ذرائع (کتب وجرائد) اور جدید الیکٹرانک ذرائع سے جن افراد سے ربط قائم ہو اُس کی تکمیل کے لیے ملاقاتوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

(د) ہر قسم کے ذرائع میں ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں کہ مخاطب کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا موقع مل سکے۔

(ہ) اسلامی مزاج — شائستہ زبان اور سنجیدہ اسلوب کا متقاضی ہے۔ سماجی ذرائع (سوشل میڈیا) سے استفادے کی ایسی صورتیں سوچنی چاہئیں جہاں اسلام کے

اس معیار کو قائم رکھا جا سکے۔

(و) اِسلامی پیغام کی ترسیل کے لیے تھیٹر اور ناٹک جیسی شکلیں مناسب نہیں ہیں۔ ان سے کسی سنجیدہ پیغام کی ترسیل ممکن نہیں ہوتی۔

(ز) سماجی ذرائع (سوشل میڈیا) کے مباحث میں شور کی کیفیت سے بچنا چاہیے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان ذرائع کو ترک کیا جائے۔

☆☆☆

انکارِ حق کے محرکات

جولوگ دعوت واصلاح کا کام کرتے ہیں، ان کو یہ سوال اکثر پریشان کرتا ہے کہ راہِ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی لوگ حق کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ ذیل کی سطور میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ قرآنِ مجید اس سوال کا کیا جواب دیتا ہے؟ یعنی قرآن مجید کے مطابق کن لوگوں کو ہدایت ملتی ہے اور کون اس سے محروم رہ جاتے ہیں؟

ہدایت اور اذنِ الٰہی

داعی حق کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تبلیغ کے تمام آداب کا لحاظ رکھے، مخاطب کے ذہن کو سامنے رکھ کر دل نشیں انداز میں دلائل پیش کرے، آفاق وانفس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر حق کو واضح کرے، موعظتِ حسنہ سے کام لے، صبر کے ساتھ مخاطب کے سوالات کو سُنے اور اُن کا جواب دے اور اپنی بساط بھر مخاطب پر حجت تمام کر دے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود یہ ممکن ہے کہ مخاطب دعوتِ حق کو قبول نہ کرے۔ یہ تجربہ ہر داعی کو ہوتا رہتا ہے۔ ایسی صورتِ حال پیش آنے پر مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے داعیِ حق کو یہ حقیقت اپنے ذہن میں تازہ کر لینی چاہیے کہ کسی شخص کو بہ ہر صورت ہدایت دے دینا اُس کا کام نہیں ہے، بلکہ ہدایت ملنے یا نہ ملنے کا تعلق اللہ کی مشیت سے ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ○ (القصص:۵۶)

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے، جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں۔''

اس بنیادی حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہدایت سے متعلق مشیتِ الٰہی جس سنت کے تحت کام کرتی ہے وہ کیا ہے اور اس کے مطابق کون لوگ ہدایت سے فیض یاب ہوتے ہیں اور کن لوگوں کو ہدایت نہیں ملتی؟

ہدایت پانے والے

قرآن مجید انسانوں کو اُن کی سعی و جہد کے مطابق دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ اُن میں سے ایک قسم اُن انسانوں کی ہے، جن کے لیے راہِ راست پالینا آسان ہوتا ہے:

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی○ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَاتَّقٰی○ وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی○
فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی○ (الیل: ۴-۷)

''درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔ تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ مانا اُس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''

ان آیات میں راہِ راست پانے والوں کی تین اعلیٰ انسانی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے: پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آدمی زر پرست نہ ہو، بلکہ بھلائی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کے لیے تیار ہو۔ جو شخص خرچ کرنے کے مواقع پر مال کو صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا وہ دراصل اپنے انسانی مرتبے سے گر جاتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا اور اس کے وسائل کو تو اللہ نے اُسے اسی لیے بخشا تھا کہ وہ بہ وقتِ ضرورت اُن سے صحیح کام لے۔ اب اگر وہ ان وسائل پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اُن کو صحیح مصرف میں نہیں آنے دیتا تو وہ گویا اپنے اعلیٰ انسانی مقام کی خود نفی کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص مال کو بھلے کاموں میں خرچ کرتا ہے، وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دنیا اور اُس کے وسائل کی صحیح پوزیشن سے آگاہ ہے، یعنی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ دنیا کے وسائل اس کو بھلے کاموں میں استعمال کرنے کے لیے دیے

گئے ہیں۔ جو شخص اس اعلیٰ انسانی صفت کا مظاہرہ کر دے اُس کے لیے ہدایت کے راستے یقیناً کھل جانے چاہئیں۔

دوسری انسانی صفت جس کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تقویٰ ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ بقرہ کے آغاز میں کتابِ الٰہی کا تعارف کراتے ہوئے کہی گئی ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ''یہ کتابِ ہدایت ہے، پرہیز گاروں کے لیے۔'' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس ذیل میں فرماتے ہیں:

> ''(تقویٰ کی صفت سے مراد یہ ہے کہ) آدمی پرہیز گار ہو، بھلائی اور برائی میں تمیز کرتا ہو، برائی سے بچنا چاہتا ہو، بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند ہو۔ رہے وہ لوگ جو دنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہوں، جنہیں کبھی یہ فکر لاحق نہ ہوتی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں، بس جدھر دنیا چل رہی ہو، یا جدھر خواہش نفس دھکیل دے، یا جدھر قدم اٹھ جائیں، اسی طرف چل پڑتے ہوں تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن میں کوئی رہ نمائی نہیں ہے۔'' (تفہیم القرآن، سورہ البقرۃ، حاشیہ: ۳)

ہدایت پانے کے لیے تیسری صفت، جس کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی حق اور راستی کا قدرداں ہو۔ جب حق اُس کے سامنے آئے تو وہ اسے ایک قیمتی متاع سمجھے اور شوق و ذوق کے ساتھ اس کی طرف لپک پڑے اور جب سچائی اس پر کھل جائے تو وہ پوری جرأت کے ساتھ اس کی تصدیق کرے۔ رہے وہ لوگ جو حق کو حق ماننے سے پہلے 'نفع و نقصان' کا حساب لگائیں اور اگر اُن کی کوتاہ بیں آنکھوں کو قبولِ حق کے راستے میں دنیا کا ظاہری گھاٹا نظر آئے تو حق سے منہ پھیر لیں تو ایسے لوگ یقیناً ہدایت کے مستحق نہیں ہیں۔ داعیِ حق کی بات اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

عشق فرمودہ قاصد یہ سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

ہدایت سے محروم رہنے والے

سطور بالا میں ہدایت پانے والوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک قسم کے انسان

ہیں۔انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جو ہدایت سے محروم رہتی ہے۔ یہ محرومی بلا وجہ نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ اُن کی اپنی مساعی ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

وَ اَمَّا مَنۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ○ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ○ وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ○ (الیل:۸-۱۱)

''اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا، جب کہ وہ ہلاک ہو جائے۔''

بخل، حق سے بے نیازی اور بھلائی کو جھٹلانا، یہ وہ ناپسندیدہ صفات ہیں جو انسان کو ہدایت سے محروم رکھتی ہیں۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ان صفات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بخل سے مراد محض وہ بخل نہیں ہے جس کے لحاظ سے عام طور پر لوگ اس آدمی کو بخیل کہتے ہیں جو روپے جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اور اسے نہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہے، نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ اس جگہ بخل سے مراد راہِ حق میں اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال صرف نہ کرنا ہے، اور اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر، اپنے عیش و آرام پر، اپنی دل چسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر لٹاتا ہے، مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا، یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، نام و نمود، حکام رسی، یا کسی اور قسم کی منفعت حاصل ہوگی۔ بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مادّی فائدوں ہی کو اپنی ساری تگ و دو اور محنت اور کوشش کا مقصود بنا لے اور خدا سے بالکل مستغنی ہو کر اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ کس کام سے وہ خوش اور کس کام سے وہ ناراض ہوتا ہے۔ رہا بھلائی کو جھٹلانا تو وہ اپنی تمام تفصیلات میں بھلائی کو سچ ماننے کی ضد ہے۔'' (تفہیم القرآن، سورۂ لیل، حاشیہ:۴)

استکبار

ہدایت سے محرومی کا ایک سبب استکبار اور غرورِ نفس ہے۔قرآنِ مجید میں اس کا تذکرہ

کیا گیا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

(الاعراف: ۳۵، ۳۶)

''اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس پیغمبر آئیں، جو تم ہی میں سے ہوں گے، جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے تو جو شخص پرہیز گاری اختیار کرے اور اصلاحِ احوال کرے تو ایسے لوگوں پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ اور جو لوگ ہمارے ان احکام کو جھوٹا بتائیں گے اور اُن سے تکبر کریں گے، وہ لوگ دوزخ والے ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ○ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ○ (الاعراف: ۴۰، ۴۱)

''اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اُن (کے ماننے) سے تکبر کرتے ہیں، اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر سے نہ چلا جائے اور ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ اُن کے لیے (آتشِ) دوزخ کا بچھونا ہوگا اور اُن کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا ہوگا اور ہم ایسے ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔''

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ

فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ○ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ○ (الاعراف:۱۳۰-۱۳۳)

''ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیدوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید اُن کو ہوش آئے۔ مگر اُن کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لیے فالِ بد ٹھہراتے، حالاں کہ درحقیقت اُن کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی، مگر اُن میں سے اکثر بے علم تھے۔ انھوں نے موسیٰ سے کہا: تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے، ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ آخر کار ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سرسریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں، مگر وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ تھے ہی جرائم پیشہ۔''

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ○ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ○ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ○ لَاجَرَمَ اَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ○ (النحل:۲۰، ۲۳)

''اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں، بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مردہ ہیں نہ کہ زندہ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انھیں کب (دوبارہ زندہ کرکے) اٹھایا جائے گا۔ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، اُن کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں۔ اللہ یقیناً ان کے سب کرتوت جانتا ہے۔ چھپے ہوئے بھی اور کھلے ہوئے بھی۔ وہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرورِ نفس میں مبتلا ہوں۔''

مستکبرین کی پیروی

یہ ایک مخصوص انسانی کردار ہے جس کا تذکرہ درج بالا آیات میں کیا گیا ہے۔ اس کردار کے حاملین تکبر اور غرورِ نفس کی بنا پر ہدایت الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ اس کردار کے پہلو بہ پہلو ہدایت سے محروم رہ جانے والا ایک اور کردار بھی انسانی سماج میں پایا جاتا ہے۔ یہ کردار اُن لوگوں کا ہے جو دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے (مستضعفین تھے)۔ ان 'دبا کر رکھے گئے لوگوں' نے اپنی عقل سے کام نہیں لیا اور آنکھیں بند کر کے مستکبرین کی پیروی اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح مستکبرین ہدایت سے محروم رہے تھے، اسی طرح یہ مستضعفین بھی ہدایت سے محروم رہے۔ قرآن مجید میں اِن گھمنڈیوں اور اُن کے اندھے پیروؤں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ○ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (سبا: ۳۱-۳۳)

''یہ کافر کہتے ہیں کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے۔ کاش! تم دیکھو ان کا حال اُس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے، جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے، وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ

ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا، جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے: نہیں، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی، جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہم سر ٹھیرائیں۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اُن کے اعمال تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں۔''

وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ○ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ○ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰى قَالُوْا فَادْعُوْا وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ○ (المومن: ۴۷-۵۰)

''پھر ذرا خیال کرو اس وقت کا جب یہ (منکرینِ حق) دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دنیا میں جو لوگ کم زور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ (دنیا میں) ہم تمہارے تابع تھے۔ اب کیا یہاں تم نارِ جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچا لوگے؟ وہ بڑے بننے والے جواب دیں گے: ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے۔ پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے: اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے۔ وہ پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس تمہارے رسول بینات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟ وہ کہیں گے: ہاں! جہنم کے اہل کار بولیں گے: پھر تو تم ہی دعا کرو اور کافروں کی دعا اکارت ہی جانے والی ہے۔''

مذکورہ بالا آیات کا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کم زور لوگوں (مستضعفین) کو بری الذمہ قرار نہیں دیا ہے۔ بلاشبہ جہاں تک مستکبر ین کا تعلق ہے اُن کو اپنی گم راہی کی سزا بھی ملے گی اور دوسروں کو گم راہ کرنے کی بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کم زور لوگ (جو دبا کر رکھے گئے تھے) گرفت سے بچ جائیں گے، بلکہ جو گم راہی انھوں نے اختیار کی تھی (خواہ مستکبر ین کی پیروی میں کی ہو) اس کے وہ خود ذمے دار ٹھیرائے جائیں گے اور اس کا خمیازہ اُن کو بھگتنا ہوگا۔ اس طرح قرآن مجید نے انسان کی انفرادی مسئولیت کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس تنبیہ کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص آنکھ کھول کر زندگی گزارے اور یہ دیکھے کہ وہ کن لوگوں کی پیروی اختیار کر رہا ہے اور کن افراد کے طریقوں کی اتباع کر رہا ہے۔ آخرت میں وہ اپنی گم راہی کا الزام اپنے رہ نماؤں پر نہیں رکھ سکے گا اور نہ اُن رہ نماؤں کی غلط روی کی دہائی دے کر اپنی سزا میں کچھ کمی کرا سکے گا۔ قرآن مجید کی یہ وارننگ (تنبیہ) کسی بھی انسانی سماج کے ہر طبقے کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہے۔ بشرطیکہ اس پر دھیان دیا جائے۔

خواہشِ نفس کی پیروی

کسی انسان کی حق سے محرومی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ وہ راہِ حق کو اختیار نہیں کرتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ راہِ حق پر چلنے میں اس کو اپنی خواہشات پر کنٹرول کرنا ہوگا اور اُن کو شریعتِ الٰہی کے تابع بنانا ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے:

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الروم: ۲۹،۳۰)

”مگر یہ ظالم بے سمجھے بوجھے اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو۔ ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں

ہوسکتا۔ پس (اے نبیؐ اور نبی کے پیروؤ!) یکسو ہوکر اپنا رخ اس دین کی سمت جمادو۔ قائم ہوجاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ○ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (القصص:۴۸۔۵۰)

''مگر جب ہمارے ہاں سے حق اُن کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے: کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ کیا یہ لوگ اس کا انکار نہیں کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انھوں نے کہا: دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اور کہا: ہم کسی کو نہیں مانتے۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہو: اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو ان دونوں (یعنی تورات اور قرآن) سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو۔ اگر تم سچے ہو، میں اسی (کتاب) کی پیروی اختیار کروں گا۔ اب اگر وہ تمھارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں۔ اور اس شخص سے بڑھ کر گم راہ کون ہوگا، جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔''

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ○ وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○

(المائدۃ:۷۰،۷۱)

''ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور اُن کی طرف بہت سے رسول بھیجے، مگر جب کبھی اُن کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشاتِ نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو کسی کو انھوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہوگا، اس لیے اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو اُن میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے بہرے بنتے چلے گئے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔''

تقلیدِ آباء

ہدایتِ الٰہی سے محرومی کا ایک سبب آباء و اجداد کی بلا سوچے سمجھے تقلید ہے۔ آباء و اجداد کی محبت فطری ہے، لیکن انسان کو چاہیے کہ اس محبت کو حق کی محبت پر غالب نہ آنے دے۔ قرآن مجید میں کھانے پینے کے متعلق جاہلی رسوم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○ (المائدۃ: ۱۰۳، ۱۰۴)

''اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام، مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور اُن میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیات کو مان رہے ہیں)۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے جائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستے کی انہیں خبر ہی نہ ہو۔''

بعض مشرکین نے ملائکہ کو خدائی میں شریک ٹھیرا رکھا تھا اور اس فعل کے لیے آباء و

اجداد کی سند پیش کرتے تھے۔ قرآن نے اس طرزِ عمل کی نامعقولیت کی طرف توجہ دلائی ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ○ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ (الزخرف:۱۹-۲۵)

''انھوں نے فرشتوں کو، جو خدائے رحمن کے خاص بندے ہیں، عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کے جسم کی ساخت انھوں نے دیکھی ہے۔ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں کہ اگر خدائے رحمن چاہتا (کہ ہم اُن کی عبادت نہ کریں) تو ہم کبھی اُن کو نہ پوجتے۔ یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے، محض تیر تکّے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی، جس کی سند (اپنی اس ملائکہ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہوں۔ نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے اُن سے پوچھا: کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے، خواہ میں تمھیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں، جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انھوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو، ہم اس کے کافر ہیں۔ آخرکار ہم نے اُن کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔''

داعیِ حق کی ذمے داری

سطور بالا میں ہدایت سے محرومی کے چند اسباب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ اسباب ہیں: بخل، حق سے بے نیازی، سچائی کی تکذیب، استکبار اور غرورِ نفس، مستکبرین کی اتباع، خواہشِ نفس کی پیروی اور تقلید آباء۔ بہ ہر حال سبب کوئی بھی ہو، داعی حق کے لیے مالکِ کائنات کی مستقل ہدایت یہ ہے کہ وہ مایوس ہوئے بغیر اپنا کام جاری رکھے اور منکرین کی روش سے غم زدہ نہ ہو:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ○اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ○

(النحل:۱۲۷،۱۲۸)

”اے نبیؐ! صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ اِن لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان کی روش اختیار کرتے ہیں۔“

☆☆☆

عصرِ حاضر کا مزاج اور اسلوبِ دعوت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منصبِ عظیم کا تعارف قرآن مجید میں اِس طرح کرایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

''اے نبیؐ! ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات اس تصریحِ قرآنی کی روشنی میں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں: شاہد (گواہ)، مبشر (خوش خبری دینے والا)، نذیر (خبردار کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا)، سراجِ منیر (روشن چراغ یعنی واضح نمونہ اور منبع ہدایت)۔ اِن اوصاف میں مرکزی حیثیت، آپ کی داعیانہ صفت کو حاصل ہے۔ نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد اپنی ۲۳ سالہ زندگی میں جو کارنامہ آپ نے انجام دیا وہ اِس کارِ دعوت پر مشتمل ہے۔ قرآن مجید نے مذکورہ آیات سے قبل اِس امر کی بھی تصریح کی ہے کہ آپ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ (الاحزاب: ۴۰)

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم، تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آخری نبی ہونے کی بنا پر آپ کی نبوت کا دور، قیامت تک وسیع ہے،

چنانچہ دعوت الی اللہ کے سلسلہ کا بھی قیامت کے ظہور تک جاری رہنا لازم ہے۔ دنیا سے آپ کے تشریف لے جانے کے بعد، اَب اِنسانوں کو عملاً اللہ کی طرف بُلانے کا کام، اُمتِ مسلمہ کو انجام دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہلِ ایمان، دعوت الی اللہ کے اِس فریضے کی انجام دہی کے لیے اُسوۂ نبوی سے روشنی حاصل کریں گے اور اِس راہ میں پیش آنے والے مسائل کا حَل، سیرت نبوی میں تلاش کریں گے۔

ہر زمانہ کی طرح موجودہ دور میں بھی، دعوتِ حق پیش کرنے کے لیے، مخاطبین کے مزاج سے واقفیت ضروری ہے تا کہ مناسب اسلوبِ دعوت کا انتخاب کیا جا سکے۔ یہ واقفیت حاصل کرنے کے لیے جب ہم عصرِ حاضر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو موجودہ دور کے چند پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں:

(الف) بے یقینی اور مایوسی

(ب) سطحیت اور ظاہر بینی

(ج) خود فراموشی

(د) بے اطمینانی و اضطراب

(ہ) مقصدِ زندگی سے محرومی

عصرِ حاضر میں دعوتِ حق کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مخاطب اِنسانوں کی درج بالا کیفیات کو سامنے رکھا جائے۔ پھر اُن کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے، اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں، اُن کو حق کی طرف بلایا جائے۔

بے یقینی اور مایوسی

چند سو سال قبل یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہوا تو اُس کے ساتھ مذہب کے انکار کا قوی رجحان بھی سامنے آیا۔ مذہب کو رد کرنے کے بعد اُس کے متبادل کے طور پر یورپ کے اہلِ فکر نے مادہ پرستانہ نظریات اور فلسفوں کو اختیار کیا، لیکن یہ فلسفے، اِنسان کو یقین کی منزل تک نہ پہنچا سکے۔ چند صدیوں کے تجربے کے بعد مغربی دنیا اب مادہ پرستانہ نظریات سے

تقریباً مایوس ہوچکی ہے اور ان نظریات کے ردّعمل میں بے یقینی کی فضا عام ہوتی جارہی ہے۔ بہت سے سوچنے والے، صاف طور پر کہنے لگے ہیں کہ ''حقیقت کا ادراک ممکن ہی نہیں چنانچہ کسی یقینی نظریے کی تلاش بے کار ہے۔'' اقبال نے اِس صورت حال کی طرف اشارہ کیا تھا۔

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے، مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ الاّ

بے یقینی کی کیفیت ، اِنسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے جس کے بہت سے مظاہر آج کی دنیا میں نظر آتے ہیں۔

داعیانِ حق کو بے یقینی کی اِس فضا کو بدلنا ہے اور عصرِ حاضر کے اِنسان کو پھر یقین کی کیفیت سے لذت آشنا کرنا ہے۔ اسوۂ نبوی کی روشنی میں اس کے لیے چند امور کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں پہلا قدم اللہ اور اس کے رسول پر اعتماد کی تلقین ہے۔ (جسے ایمان لانا کہتے ہیں) اس اقدام کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ اِنسان کو جاننا چاہیے کہ وہ محض اپنی عقل کے سہارے، بالاتر حقائق کا ادراک نہیں کرسکتا اِس لیے ضروری ہے کہ وہ کسی جاننے والے پر اعتماد کرے۔ دوسری جانب یہ احتیاط بھی لازم ہے کہ وہ کسی گم راہ کرنے والے شیطان کے پھندے میں نہ پھنس جائے کہ بلا سوچے سمجھے اُس کی بات مان بیٹھے۔ محض اپنی عقل پر اعتماد ہو یا آنکھ بند کرکے کسی شیطان کی پیروی ہو، یہ دونوں طریقے انسان کو تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے مقابلے میں اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان، درست رویہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''ایمان کا مزہ چکھا اُس شخص نے جو اس بات پر راضی ہوگیا کہ اللہ اُس کا رَب ہے، اِسلام اُس کا دین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔'' (بخاری و مسلم)

ایمان کے اِس اعلان کے ساتھ، انسان کے شعوری سفر کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اس سفر کے دوران ،قلب مومن میں یقین کی کیفیت راسخ تر ہوتی جاتی ہے بشرطیکہ اِنسان دو باتوں کا اہتمام کرے: (الف) اللہ کی نشانیوں پر غور وفکر اور (ب) اللہ کی راہ میں کوشش اور قربانی۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ (آلِ عمران: ۱۹۰، ۱۹۱)

''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دِن کے باری باری آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں): پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رَب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔''

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین وآسمان کی نشانیوں پر غور وفکر سے، آخرت پر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح اللہ کی راہ میں جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ ۛؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ وَّ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ﴿۱۷۳﴾ (آل عمران: ۱۷۲، ۱۷۳)

''جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور اُس کے رسول کی پکار پر لبیک کہا— اُن میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں اُن سے ڈرو تو یہ سُن کر اُن کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔''

اِن آیات میں بتایا گیا ہے کہ راہِ خدا میں جہاد، ایمان میں اضافے کا سبب ہے۔

جو داعیانِ حق، عصرِ حاضر کے اِنسان کو بے یقینی کی موجودہ کیفیت سے نکالنے اور یقین کی طرف اُسے لے جانے کے لیے کوشاں ہیں پہلے اُن کو خود اپنے قلب میں یقین کی کیفیت کو پیدا اور راسخ کرنا ہوگا۔ سیرت نبوی کا سنجیدہ مطالعہ، اس سلسلے میں اہم عامل کا کام کرسکتا ہے۔ اس مطالعے کے ذریعے، قاری تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو گویا مجلسِ نبوی میں موجود پاتا ہے اور اس بابرکت مجلس میں بالواسطہ شرکت کرکے، وہ اپنے ایمان کو زندگی بخش سکتا ہے۔

سطحیت اور ظاہر بینی

اِنسان خاکی مخلوق ہے لیکن اللہ نے اُسے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ ایمان، اخلاصِ نیت اور حسنِ عمل کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرسکتا ہے۔ اگر وہ اپنی حقیقت سے غافل ہوجائے تو وہ سطحیت اور ظاہر بینی کا شکار ہوجاتا ہے۔ پھر پستیوں کی طرف جانے سے اُسے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ اِنسان کے سلسلے میں اِن دونوں امکانات (ترقی یا تنزل) کا احتمال ہے۔ قرآن مجید میں اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ (التین: ۴،۵)

”بلاشبہ ہم نے اِنسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اُسے اُلٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کردیا۔“

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اِن آیات کی تشریح کے ضمن میں لکھتے ہیں:

”اِنسان کو اللہ نے پیدا کیا اور بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا۔ اِس کا قوام ایسی ترکیب سے بنایا کہ اگر چاہے تو نیکی اور بھلائی میں ترقی کرکے فرشتوں سے آگے نکل جائے، کوئی مخلوق اُس کی ہم سری نہ کرسکے۔ لیکن اِنسان خود اپنی بدتمیزی اور بدعملی سے ذلت وہلاکت کے گڑھے میں گرتا اور اپنی پیدائشی بزرگی کو گنوا دیتا ہے۔“

اِنسان کو سطحیت اور ظاہر بینی سے بچانے کے لیے، اُس کو حقائقِ غیب اور آخرت کی

طرف متوجہ کرنا ضروری ہے۔ محض دنیا کے وسائل کا استعمال، اِنسان کو پستیوں سے نہیں نکال سکتا۔

وہ قوم جو فیضانِ سماوی سے ہے محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

واقعہ یہ ہے کہ جب انسان، سطحیت اور دنیا پرستی پر قابو پالیتا ہے تو وہ حقیقی معنوں میں اِنسان بننے لگتا ہے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

''تین باتیں مومنانہ اخلاق میں سے ہیں:

(۱) جب مومن کو غصہ آتا ہے تو اُس کا غصہ اُسے باطل اختیار کرنے پر نہیں اُبھارتا۔

(۲) جب وہ خوش ہوتا ہے تو خوشی اُس کو دائرہ حق سے باہر نہیں نکلنے دیتی اور

(۳) جب وہ طاقت ور ہوتا ہے تو دوسروں کی چیز نہیں چھینتا۔'' (مشکوٰۃ)

چنانچہ سطحیت اور ظاہر بینی کے بجائے وقار، حلم و بردباری اور فکرِ آخرت — وہ اعلیٰ صفات ہیں جن کو آج کا انسان — اُسوہ نبوی سے سیکھ سکتا ہے۔ داعیانِ حق کو اس امر کی تلقین کرنی چاہیے۔

خودفراموشی (ALIENATION)

غیب کے اِنکار کا رجحان، اِنسان اور انسانی سماج پر گونا گوں منفی اثرات ڈالتا ہے، اِن اثرات میں سے ایک اہم مظہر، انسان کی خودفراموشی ہے۔ بالاتر حقائق کے ادراک سے قاصر انسان، اپنی صحیح حیثیت پہنچاننے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ کبھی اپنے کو حیوان سمجھتا ہے، کبھی دنیا کے وسائل پر متصرف ایک خودمختار ہستی گردانتا ہے اور کبھی معاشی و صنعتی مشین کا محض ایک پُرزہ سمجھتا ہے۔ اِس خودفراموشی سے اِنسانی شخصیت، مسخ ہوجاتی ہے اور انسانی نفسیات میں گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ داعیانِ حق کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسان کو خود اپنے آپ سے متعارف کرائیں۔ شداد بن اوسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

''ہوشیار اور عقل مند وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس امارہ (بُرائی پر اُکسانے والے نفس) کو قابو میں رکھا (اور دنیا کی محبت میں گرفتار نہیں ہوا) اور موت کے بعد آنے

والی زندگی کے لیے عمل کیے، اور بے وقوف وہ ہے جس سے اپنے آپ کو دنیا کی محبت میں غرق کر دیا اور اللہ سے غلط توقع باندھی۔'' (ترمذی)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود فراموشی سے بچنے کے لیے نفسِ امارہ کو قابو میں رکھنا ضروری ہے تا کہ انسان محض دنیوی ضروریات کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا اور آخرت سے غافل شخص نہ بن جائے بلکہ اُسے یاد رہے کہ وہ اللہ کا بندہ اور زمین میں اُس کا خلیفہ ہے۔

خود فراموشی کی دوسری شکل یہ ہے کہ اِنسان تکبّر کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسرے اِنسانوں سے بڑا بننا چاہتا ہے اور اِس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ اِنسان کی حیثیت محض بندے کی ہے اور بڑائی صرف اللہ (رَب حقیقی) کے لیے ہے۔ داعیانِ حق کو چاہیے کہ خود فراموشی کی اِس صورت سے بھی انسانوں کو بچائیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے ٹیک لگا کر کھانا کھاتے نہیں دیکھا اور کبھی کسی نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ دو آدمی بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوں (جیسا کہ بادشاہوں کا دستور ہے۔ وہ باڈی گارڈ رکھتے ہیں جو ہٹو، بچو کی صدائیں لگاتے ہیں)۔'' (ابوداؤد)

حضرت قدامہ بن عبداللہؓ کہتے ہیں: ''میں نے نبی صلی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، قربانی کے دِن، بھورے رنگ کی اونٹنی پر سوار، جمرہ کو کنکری مارتے دیکھا۔ نہ وہاں سپاہیوں کی مار پیٹ تھی، نہ کسی کو گالیاں دی جا رہی تھیں، نہ ہٹو، بچو کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔'' (المنذری)

حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر میں اپنے قافلے کے پیچھے چلتے، کم زوروں کو اپنی سواری پر بٹھا لیتے اور اُن کے حق میں دعا کرتے۔'' (ابوداؤد)

بے اطمینانی واضطراب

آج ٹکنالوجی کی ترقی نے وسائلِ حیات کے بیش از بیش استعمال پر اِنسان کو قادر کر دیا ہے اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی قابل لحاظ تعداد کو ذہنی سکون اور دِل کا اطمینان میسر نہیں ہے بلکہ وہ بے چینی اور اضطراب کے شکار ہیں۔ اسوۂ نبوی میں اِنسان کی اِس کیفیت کا علاج موجود ہے۔ داعیان حق کو چاہیے کہ سیرت کے اِس پہلو سے لوگوں کو

واقف کرائیں تا کہ وہ بے اطمینانی واضطراب سے نجات پاسکیں۔

حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کھانے سے فارغ ہوتے اور دسترخوان اُٹھالیا جاتا تو فرماتے شکر ہے اللہ کا، بہت زیادہ اور بابرکت شکر — ایسا شکر جو ہم خود کریں، جو کبھی ہم سے ترک نہ ہو اور جس سے ہم کبھی بے نیاز اور بے پروانہ ہوں — اے ہمارے رَب۔ (بخاری)

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا، پسندیدہ خصلت ہے جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنے عمل سے دی ہے۔ علاوہ ازیں جو شخص شکر ادا کرتا ہے اُس کا دِل، بے اطمینانی اور اضطراب سے نجات پاتا ہے۔ آج کے اِنسان کو اللہ کی نعمتوں کے اعتراف اور شکر کی ادائیگی کی جانب متوجہ کرنا، داعیانِ حق کا کام ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ دین آسان ہے۔ اور دین سے جب بھی مقابلہ کیا جائے گا، وہ مقابلہ کرنے والوں کو شکست دے دے گا۔ پس تم لوگ سیدھے راستے پر چلو۔ شدت پسندی اور غلو سے بچو۔ اپنی نجات سے مایوس نہ ہو۔ خوش رہو کہ تم کو نجات ملے گی انشاء اللہ۔ کچھ صبح کو چل لو، کچھ شام کو چل لو اور کچھ رات میں چل لو۔'' (بخاری)

مندرجہ بالا حدیث بتاتی ہے کہ اِنسان اپنے غیر متوازن رجحانات کی اتباع کرنے کے بجائے، اُسوہ نبوی کا اتباع کرے تو پریشانی واضطراب سے محفوظ رہے گا اور انشاء اللہ — آخرت میں اُسے جہنم سے نجات مل جائے گی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ بھیجتے وقت، آپ نے مجھ سے فرمایا: ''اے معاذ! اپنے آپ کو عیش وعشرت میں پڑنے سے بچانا کیوں کہ خدا کے بندے عیش کوش نہیں ہوتے۔''

سیرت نبوی سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو جو نصیحت فرمائی، خود آپ اُس پر عمل پیرا تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں عیش کوشی کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ عیش وعشرت سے گُریز، بے اطمینانی و اضطراب سے بچنے کے لیے ضروری تدبیر ہے۔ داعیانِ حق سیرت کے اِس پہلو سے دنیا کو واقف کراسکتے ہیں۔

مقصدِ زندگی سے محرومی

آج کا انسان وسائل حیات کی دریافت اور اُن کے بیش از بیش استعمال میں لگا ہوا ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ محض یہ سرگرمی، انسان کی زندگی کا مقصد نہیں قرار پاسکتی۔ یقیناً اخلاقی حدود کے احترام کے ساتھ وسائلِ حیات کا استعمال اِنسان کے لیے جائز ہے اور یہ استعمال شکر کے جذبے کے ساتھ ہوتو مطلوب اور پسندیدہ بھی ہے لیکن اسے مقصدِ زندگی نہیں کہا جاسکتا۔قرآن مجید کا ارشاد ہے:

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ (البقرہ:۲۰۰ تا ۲۰۲)

”جب تم حج کے ارکان، ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباء واجداد کا ذکر کرتے تھے، اِس طرح اب اللہ کا ذکر کرو۔ بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر۔ (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) اُن میں کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رَب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دیدے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رَب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔“

اِنسان محض مادی وجود نہیں چنانچہ اس کی زندگی کا مقصد بھی مادی کامیابیوں تک محدود نہیں ہوسکتا۔ درست مقصد زندگی کی تعیین کے لیے اُسوہ نبوی میں رہ نمائی ملتی ہے۔ عصرِ حاضر کے انسان کو اس رہ نمائی سے آگاہ کرنا، دعوتِ اسلامی کا اہم جز ہے۔ اِنسانی شخصیت کی نشو ونما کے لیے مقصدِ زندگی کی درستگی اور درست مقصد سے اِنسان کی وابستگی، دونوں ضروری ہیں۔

حضرت عمار بن یاسرؓ کہتے ہیں کہ ''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ قیس کے پاس، دینی احکام کی تعلیم وتبلیغ کے لیے بھیجا۔ وہاں پہنچ کر تجربے سے معلوم ہوا گویا اِس قبیلے کے لوگ، بِدکے ہوئے اونٹ ہیں، وہ دنیا کے حریص تھے، اُن کا کوئی نصب العین نہ تھا۔ ان کی ساری دل چسپی، اپنی بکریوں اور اونٹوں سے تھی۔ جب میں وہاں سے لوٹ کر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا: ''اے عمار! کیا کیا؟'' (یعنی اپنے کام کی رپورٹ دو) میں نے عرض کیا: ''اس قبیلے (یعنی قبیلہ قیس) کے لوگ دین سے بالکل غافل ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''ان سے زیادہ تعجب خیز حال اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے جاننے کی حد تک تو سب کچھ جان لیا، لیکن (جہاں تک عمل کا تعلق ہے) اُسی غافل قبیلے کی طرح دین سے غافل اور بے پرواہو گئے۔'' (طبرانی)

حضرت عبد اللہ ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم عینہ (سود جیسی کاروباری صورت) کے ساتھ کاروبار کرنے لگو گے، جب تم بیل کی دُم تھام لو گے اور کھیتی باڑی میں مگن ہو جاؤ گے اور دین کے قیام کی مہم میں محنت ومشقت سے جی چُراؤ گے اور مالی وجانی قربانی سے گریز کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت ومحکومی مسلط کر دے گا جو تم سے کبھی نہ ہٹے گی جب تک اپنے دین کی طرف نہیں پلٹو گے۔'' (ابوداؤد)

اِن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی مرکزی سرگرمی، روزی کمانا نہیں ہے بلکہ دینِ حق کا قیام اور اُس کی دعوت وتبلیغ ہے۔ اس راہ میں جانی ومالی قربانی درکار ہو تو خوش دلی کے ساتھ پیش کی جانی چاہیے۔ جو لوگ اس شعور سے بے گانہ ہیں، وہ زندگی کے مقصد سے محروم ہیں۔

عصرِ حاضر مَلک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری، دے کے تجھے فکر معاش
وہ جنوں، چھین لیا، حِرص و ہوس نے تجھ سے
جو یہ کہتا تھا خِرد سے کہ بہانے نہ تراش

☆☆☆

معاصر دنیا اور دعوتِ اسلامی

دنیا کے حالات، ملک کے احوال اور ہندوستان میں امت مسلمہ کی صورت حال نے دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں بعض اہم سوالات کی جانب اہل دانش کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ باشعور مسلمان جانتے ہیں کہ جن اہم میدانوں میں عملی سرگرمی مطلوب ہے، ان میں سے ایک دعوت اسلامی کا میدان ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں میں ایک اہم بنیادی اور کلیدی ذمہ داری اللہ کی طرف انسانوں کو بلانا ہے۔ اس پکار کو دعوتِ دین یا دعوت اسلامی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَّ قَالَ إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ○ (حمٓ السجدة: ۳۳)

”اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہو سکتی ہے، جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور یہ اعلان کرے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔“

اس آیت کا عملی نمونہ سیرتِ پاک ہے۔ نبی ﷺ پوری نبوی زندگی میں انسانوں کو اللہ کی طرف بلاتے رہے۔ آپ کے بعد یہ فریضہ ہر دور میں باشعور مسلمانوں نے انجام دیا۔ چاہے حالات نرم اور سازگار رہے ہوں یا سخت اور ناموافق ؎

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

اسلامی پیغام کی فکری اساس

تاریخ کا کوئی دور اربابِ عزیمت سے خالی نہیں رہا۔ ہر زمانے میں فریضۂ دعوت،

امت کے باشعور افراد ادا کرتے آئے ہیں۔ تاہم باخبر افراد جانتے ہیں کہ دعوت الی اللہ کا کام اصولاً ایک مستقل کام ہونے کے باوجود، ہر دور میں کچھ نئے سوال (چیلنج) لے کر آتا ہے۔ زمانے کی ہر کروٹ کے ساتھ کچھ نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ دعوت اسلامی کا کام انجام دینے والے، ان چیلنجز کا شعور حاصل کریں اور ابھرنے والے سوالات کا جواب فراہم کریں۔ تبھی ان کا کام مؤثر اور نتیجہ خیز ہوسکتا ہے۔ اس موضوع پر غور کرتے ہوئے (ہمارے ملک کی حد تک) جماعت اسلامی ہند کی دعوتی مساعی کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ جماعت نے اقامتِ دین کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے، اس کے تقاضے متعین کیے ہیں، کام کے میدانوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان امور کی تفصیل جماعت کے پالیسی و پروگرام میں بیان کی گئی ہے۔ ان کاموں میں پہلا کام، دین کی دعوت ہے۔ یہ فریضہ خاص طور پر غیر مسلموں کے درمیان انجام دینا ہے۔ اسی طرح مسلمان معاشرے کی تعمیر، ہمہ جہتی جدوجہد کی متقاضی ہے۔ سرگرمی کے دیگر اہم دائرے بھی توجہ چاہتے ہیں۔ یعنی ملک وملت کے مسائل کا حل، خدمت خلق اور کارکنوں کی تربیت و تنظیم۔

عملی مساعی کی اس تفصیل کے سیاق میں ایک بات ذہن میں رہنی چاہیے، گرچہ وہ عموماً مستحضر نہیں رہتی۔ جب منصوبے بنانے والے ضروری کاموں کی فہرست بیان کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس طرح منصوبہ بندی میں آسانی ہوتی ہے۔ پھر کوششوں کا جائزہ لینے میں بھی سہولت ہوتی ہے۔ لیکن دائروں کے اس تعین کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ کام ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ان سب کاموں میں ایک ہی روح (اسپرٹ) کام کرتی ہے۔ اگر ایک میدان میں پیش رفت ہو تو دوسرے دائروں میں اس کا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس بات بھی صحیح ہے، اگر ایک میدان کو اہل خیر نظر انداز کردیں تو پھر دوسرے کام بھی متاثر ہوجاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مختلف مساعی میں جو اصول اور نظریہ کارفرما ہے، وہ ایک ہی ہے۔ جس طرح دعوت کے میدان میں گفتگو کی بنیاد، فکر اسلامی ہے، اسی طرح سیاست میں بھی سرگرمی کی اساس، اسلامی ہونی چاہیے۔ یہی بات بطور مثال، خدمت خلق اور ملک وملت کے مسائل کے حل کے سلسلے میں

درست ہے۔ اس فکری وحدت کے تقاضے بسا اوقات، نظر کے سامنے نہیں رہتے۔ جائزہ بتاتا ہے کہ اس پہلو سے خاصی غفلت موجود ہے۔ عنوان خواہ دعوت دینِ ہو یا کوئی اور مفید سرگرمی، اسلامی مزاج یہ چاہتا ہے کہ اسلامی فکر ونظریے کے مطابق کوششوں کو انجام دیا جائے۔ اس سیاق میں نئے سوالات (چیلنجز) کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

دعوت اور داعی گروہ

حالات نت نئے سوالات داعیان حق کے سامنے لاتے ہیں، یہ سوالات دو طرح کے ہیں۔ سوالات کا ایک حصہ دعوت دین سے متعلق ہے۔ یعنی کن نکات کو بیان کریں؟ کیسے بیان کریں؟ کیا استدلال ہو؟ کن امور پر زور دیں؟ بہ الفاظ دیگر دعوت کے ذیل میں کیا کہا جائے؟ اسلام کی ترجمانی کرنے والوں کی گفتگو کا پیغام (Content) کیا ہو؟ سوالات کی ایک دوسری قسم بھی ہے، جو خود دعوت دینے والوں سے متعلق ہے۔ دعوت کا کام اصولاً ساری امت کے کرنے کا کام ہے۔ اگر چہ عملاً اس وقت (ہمارے ملک میں) جماعت اسلامی اور جماعت اسلامی جیسی کوششیں اسے، انجام دے رہی ہیں۔ دعوت کے ساتھ مسلمانوں کی صحیح رہ نمائی کی کوشش بھی کی جارہی ہے۔ اس رہ نمائی کا ایک رخ عملی ہے۔ یعنی کارکنان، دعوت دین کے کام کو آگے بڑھ کر انجام دیں اور اس طرح عملاً نمونہ پیش کر کے رہنمائی کریں۔ دعوت دین کا کام جس حد تک منظم انداز میں انجام پارہا ہے (ہمارے ملک میں ہو یا ملک کے باہر) اس میں اسلامی جماعتوں اور تنظیموں کا بڑا حصہ ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دعوت دین کی مساعی کی قیادت دینی جماعتوں کے ہاتھ میں ہے۔

اس ضمن میں جو سوالات توجہ چاہتے ہیں، وہ دعوت دینے والوں سے متعلق ہیں (چاہے اسلامی تحریکیں ہوں یا پوری امت مسلمہ ہو)۔ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ داعیان حق کی صورت حال کیا ہے؟ وہ کن پریشانیوں اور الجھنوں میں گرفتار ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے سوالات کو کار دعوت سے غیر متعلق نہیں کہا جاسکتا۔ بڑی غیر فطری توقع ہوگی کہ داعی کو جو مسائل درپیش ہیں، ان سے تعرض نہ کیا جائے اور دعوتِ دین کی بحث میں داعی کو نظر انداز

کر دیا جائے، یہ دونوں طرح کے چیلنجز اس وقت اہل حق کے سامنے موجود ہیں۔ ایک کا تعلق اسلامی دعوت کے پیغام (Content) سے ہے، یعنی کیا کہا جائے اور کیسے کہا جائے؟ اور دوسرے چیلنج کا تعلق، دین کی خدمت کرنے والی جماعتوں اور تنظیموں اور امت مسلمہ کی کیفیت سے ہے۔

دعوت کے نکات

اللہ کی طرف دعوت کی معنویت، دعوت کے بنیادی نکات اور دعوتی طریقۂ کار کی تفصیلات، یہ تمام امور قرآن مجید میں موجود ہیں۔ ان کی تشریح سیرت نبویؐ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مختصراً بنیادی نکات کی یاد دہانی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی طرف دعوت یہ ہے کہ انسانوں سے کہا جائے کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لائیں اور اس کی ہدایت کی پیروی اختیار کریں۔ جب اس دعوت کو سننے والا قبول کر لے تو الٰہی ہدایت کی تفصیلات اُس کے سامنے پیش کی جانی چاہییں۔ اساسی امور کے علاوہ دعوت حق کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی رودادِ دعوت میں اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام انسانوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ توحید کی دعوت دیتے تھے۔ شرک کی مدلل تردید کرتے تھے، آخرت پر ایمان لانے کی تلقین کرتے تھے۔ ان سب نکات پر مشتمل دعوت کے علاوہ وہ انسانی معاشرے کا جائزہ بھی لیتے تھے، جو ان کے قریب موجود تھا۔ اس ضمن میں وہ بالخصوص اپنی قوم کا جائزہ لیتے تھے، سماج میں موجود خرابیوں کی نشان دہی کرتے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتے تھے، خصوصاً نمایاں اخلاقی برائیوں سے باز آنے کی تلقین کرتے تھے۔ انبیاء کی دعوت کا یہ پہلو رودادِ دعوت میں شامل ہے۔ نبیوں نے اس پر توجہ کی ہے، جس طرح دعوت کے بنیادی نکات پر کی ہے۔ (یعنی توحید کا اثبات، شرک کی تردید اور آخرت کی جواب دہی کا استحضار)۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کی سعی، اسلامی دعوت کا لازمی جز ہے۔ اللہ کے نبیوں نے اپنے مخاطبین کو معروف کی تلقین کی ہے اور منکر سے روکا ہے۔ 'معروف' کے مفہوم میں اخلاقی

خوبیاں شامل ہیں۔ اسی طرح 'منکر' کی اصطلاح جن برائیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، ان میں اخلاقی خرابیاں سرفہرست ہیں۔ دعوت اسلامی کے یہ نکات انبیاء علیہم السلام کی سیرت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس اسوے کی روشنی میں ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ نئے چیلنجز اور نئے سوالات سے کس طرح تعرض کیا جائے۔

باطل افکار ونظریات

بیسوی صدی کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے (اور صحیح ہے) کہ اس صدی پر مشتمل دور، نظریات اور فلسفوں کا دور تھا۔ ان افکار اور فلسفوں کا پس منظر مغربی ہے۔ یعنی یہ نظریات یورپ میں ابھرے اور پھر مغربی دنیا میں جس میں امریکہ شامل ہے، ان افکار نے ارتقاء کے مراحل طے کیے۔ اس دوران مغرب کے ہاتھ میں دنیا کی امامت اور لیڈرشپ رہی۔ چنانچہ جو کچھ مغربی دنیا میں انسانیت پر گزرا وہ بالواسطہ طور پر ساری دنیا کے انسانوں پر بھی گزرا — جو سوالات وہاں اٹھے، وہ باقی دنیا میں بھی بحث کا موضوع بنے — جو باتیں وہاں کی گئیں ان کا اثر ساری دنیا نے قبول کیا۔ افکار ونظریات کے چرچے کا یہ دور ختم تو ہو رہا ہے، مگر ختم ہوا نہیں ہے۔ خاص طور پر ہمارے ملک کی حد تک تو جدید فلسفوں کے اثرات ختم نہیں ہوئے ہیں۔ جو خیالات ونظریات اب مغرب میں غیر مقبول ہیں، تیسری دنیا کے بڑے حصے پر اب بھی ان کا طلسم چھایا ہوا ہے۔ یہ کیفیت ہمارے ملک کی بھی ہے۔

اس دور کی اسلامی تحریکوں کے لٹریچر نے ایک تاریخی کام انجام دیا، یعنی متعین باطل نظریات کو بحث کا موضوع بنایا اور ان کی مدلل تردید کی۔ یہ علمی کام ابھی حالات سے غیر متعلق (Out of Date) نہیں ہوا ہے۔ یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ نظریات باطلہ کا انہدام ہو چکا۔ تاریخ کی گردش سے وہ نظریات خود ختم ہو گئے۔ اب ان کی تردید پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال درست نہیں، خصوصاً تیسری دنیا کے سیاق میں اس رائے کو حالات کا صحیح مطالعہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح، مسلمانوں اور ہندوستان کے سیاق میں مغربی نظریات کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دیکھنے کی بہرحال ضرورت ہے کہ رواں صدی میں ان

نظریات نے کیا نیا رخ اختیار کیا ہے؟ کیا نئے دلائل فراہم کیے گئے ہیں؟ ان کی تائید میں کیا نئی باتیں، اہل مغرب کہنے لگے ہیں؟ داعیانِ حق کو ان امور کا شعور ہو اور وہ باطل کی مؤثر تردید کرسکیں۔ تب دین کی ترجمانی ہو سکے گی۔

کارِ دعوت سے متعلق ہر کارکن جانتا ہے کہ یہ کام بڑا وسیع ہے۔ اس کام کا بنیادی ذریعہ ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ ہماری مجلسوں میں اس کی بار بار یاددہانی بھی ہمیں کرائی جاتی رہی ہے یعنی انسانوں سے انفرادی ربط اور گفتگو۔ ہندوستان کروڑوں کی آبادی کا ملک ہے۔ یہاں ہر سطح کے لوگ آباد ہیں۔ ذہنی صلاحیت، فکری پس منظر اور رجحانات کے اعتبار سے بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ ساری آبادی، جدید نظریات و فلسفوں سے واقف یا ان سے متاثر نہیں ہے۔ البتہ تعلیم یافتہ طبقے پر ان نظریات کا اثر پڑا ہے۔ ملک کے کارفرما عناصر، جن کا تعلق حکومت اور پالیسی سازی سے ہے اور جو ذرائع ابلاغ کی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں، وقت کے غالب فکری رجحانات سے متاثر ہیں۔

حق کی دعوت کے مخاطبین کا دائرہ وسیع ہے۔ چنانچہ ہر قسم کے سامعین کے اعتبار سے کوئی متعین تفصیلی رہ نمائی نہیں کی جاسکتی کہ داعیانِ حق کس سے کیا کہیں؟ اس سلسلے میں اصولی رہ نمائی قرآن وسنت میں ملتی ہے۔ کارکنان کے لیے وہ رہ نمائی کافی ہے۔ داعی اس بات کو یاد رکھیں کہ انھیں انسانوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے۔ پھر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اُن کا مخاطب کون ہے؟ ذہنی اعتبار سے کس سطح کا ہے؟ اسی اعتبار سے اس سے بات کرنی ہوگی۔ (انفرادی) ربط کی اہمیت کا ذکر ہو چکا ہے، وہ پہلو بھی ذہن میں تازہ رہنا چاہیے۔

داعی کو خاص طور پر ان چیلنجز پر غور کرنا ہے، جن کا تعلق ذہین طبقے سے ہے، جو کسی سماج کا کارفرما طبقہ ہوتا ہے اور جس کی رائے مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے خیالات کا دنیا پر زیادہ اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ پہلی گزارش، چیلنجز کے عنوان کے تحت یہ ہے کہ اسلامی تحریک نے جدید دور کے غلط نظریات کی تردید کا جو کام ماضی میں کیا تھا، اُسے جاری رکھنا چاہیے اور اس میں تازگی لانی چاہیے۔ اس کی تفصیلی منصوبہ بندی کی جانی چاہیے۔ یہ بات کہنا ضروری ہے کہ ہر باطل نظریے میں کچھ حق اور صداقت کا عنصر بھی

موجود ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر بسا اوقات اس کی تردید میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس دشواری کا حل کیا ہے؟ اس سلسلے میں آخر میں آپ کے سامنے کچھ عرض کیا جائے گا۔

اباحیت کا چیلنج

اب ایک دوسرے چیلنج پر غور کرنا چاہیے۔ پچھلی صدی ختم ہوئی اور دنیا پر نظریات و فلسفوں کے اثرات مدھم پڑے تو علمی دنیا میں یہ بات کہی جانے لگی (جو ایک حد تک صحیح ہے) کہ اب نظریات و افکار کا دور ختم ہوا۔ گویا دنیا ایک فکری انتشار کے دور میں داخل ہوگئی۔ فکری انتشار کے ساتھ ثقافتی وتہذیبی انتشار کا تذکرہ بھی شروع ہوا۔ جب انسانوں کو مستحکم فکری بنیاد میسر نہ ہو تو ثقافتی انتشار کا ظہور فطری ہے۔ چنانچہ اس نعرے کو مقبولیت حاصل ہوئی کہ انسان اور انسانی گروہ اپنے معاملات میں جو کچھ بھی کریں وہ درست ہے۔ تہذیب وثقافت، اخلاقی قدروں کے دائرے میں جو کچھ بھی وہ کرنا چاہیں، اس کے لیے وہ آزاد ہیں۔ پرانے معیارات (بلکہ نئے معیارات کو بھی جو دور جدید کے یورپ نے اختیار کیے تھے) دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ہر انسان اور ہر انسانی گروہ آزاد ہے۔ کھانے پینے میں، تہذیب وتمدن میں، آدابِ معاشرت میں، خاندانی روابط میں، غرض سارے انسانی معاملات میں لوگ آزاد ہیں۔ جس طرح کا رویہ چاہیں اختیار کریں۔ یہ صورت حال، نظریات کے چیلنج کے مقابلے میں شدید تر ہے۔ جو گمراہی نظریے کی شکل میں سامنے نہ آئی ہو، بلکہ ثقافت اور تہذیب کی شکل اختیار کیے ہوئے ہو، اس کے مقابلے کے لیے تقریروں اور کتابوں سے کام نہیں چلایا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ تقریروں، کتابوں اور کتابچوں (فولڈرس) کی بھی ضرورت پیش آئے گی، لیکن جاہلیت سے نپٹنے کے لیے اصل ضرورت زندہ ومتحرک صالح معاشرے کی ہوگی۔

مسلمان سماج

ہندوستان میں اور پوری دنیا میں مسلمانوں کو بڑے شدید حالات کا سامنا ہے۔ یہ

بلا شبہ درست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر بڑی عنایتیں بھی کی ہیں۔ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ احسان کیا ہے کہ مسلمانوں کا سماج ابھی تک ایک زندہ سماج ہے۔ ان کا معاشرہ مستحکم ہے، ان کے آپس کے روابط تازہ اور زندہ ہیں۔ نہ صرف ایک ایک ملک کے اندر بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے مابین روابط قائم ہیں۔ مسلمان حکم رانوں کے عمومی حالات یقیناً تشویش ناک ہیں (الا ماشاء اللہ)، ان کی غفلت اور نالائقی کا جو کچھ بھی شکوہ آپ کریں بجا ہے۔ لیکن مسلمان سماج میں یک رنگی موجود ہے۔ مسلمان کے دل اسلام سے وابستہ ہیں، ان کے اندر یہ شعور موجود ہے کہ وہ ایک عالمی امت ہیں۔ اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدریں ان کو یاد ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہمارے لیے نمونہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ خلافت راشدہ کا دور ہمارا مثالی دور ہے، تمام تر اختلافات کے باوجود مسلمانوں میں یہ تہذیبی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اس کے عملی اثرات سماج میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسلمان خاندان اب بھی بڑی حد تک انتشار سے محفوظ ہیں۔ عملی غفلت کے باوجود، حیا اور عفت کی قدریں اب بھی ان کے یہاں پسندیدہ ہیں۔

گو خود پست ہوں، پر نگاہیں ہیں بالا

اہلِ ایمان کے سامنے موجودہ دنیا، تہذیبی وثقافتی انتشار کا چیلنج سامنے لائی ہے۔ اس کے مقابلے کے لیے داعیان حق کو کچھ کہنا ہوگا، تقریریں بھی کرنا ہوں گی، کتابیں بھی لکھنا ہوں گی، لیکن سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہوگی کہ مسلمانوں کی تہذیب اور مسلم زندہ سماج سے غیر مسلموں کا ربط قائم ہو۔ ظاہر ہے یہ کام مسلمانوں ہی کو کرنا ہوگا۔ آج ایک حجاب موجود ہے، لوگ اسلام اور مسلمانوں کو نہیں جانتے، تاریخی اسباب کی بنا پر یہ کیفیت ہے کہ غیر مسلم، مسلمانوں کو نہیں جاننا چاہتے اور بہت سے مسلمانوں کے اندر بھی یہ نفسیاتی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا اور ان کے درمیان یہ حجاب باقی رہے۔ دنیا ہماری طرف متوجہ نہ ہو۔ متوجہ ہوگی تو شاید اس کی جانب سے کچھ جارحانہ اقدامات ہوں گے۔ تاہم دعوتِ حق کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنے معاشرے کو دیکھنے کا موقع، سب کو دیں۔ اس معاشرے میں بہت سی خوبیاں ہیں، دنیا کو اُن سے واقف ہونا چاہیے۔

جو خرابیاں موجود ہیں مسلمان ان کی اصلاح کریں۔ سماج کی اصلاح یوں بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

عصر حاضر کے تہذیبی اور ثقافتی انتشار کا صحیح جواب ایک زندہ معاشرہ ہے، جو صالح قدروں کی عکاسی کرے۔ جماعت اسلامی ہند کے پالیسی پروگرام میں اسلامی معاشرے کا تذکرہ موجود ہے۔ اسلامی ثقافت کو زندہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب کے مظاہر خاص طور پر نوجوانوں کی زندگی میں نظر آئیں، یہ اسلامی دعوت کی کام یابی کے لیے ضروری ہے۔

اسلام کے بارے میں سوالات

دنیا کی موجودہ فضا میں، دین اسلام کے بارے میں بعض سوالات سامنے آئے ہیں۔ سوالات غلط فہمی پر مبنی ہو سکتے ہیں، مگر جب سوالات منظر عام پر آجائیں تو پھر ان کا جواب دیا جانا چاہیے۔ اللہ کے فضل سے پوری مسلم دنیا میں اسلامی تحریکیں موجود ہیں، واضح الفاظ میں ان کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ دنیا کی اور خود اُن کے اپنے ملک کی تعمیر اسلام کے مطابق ہونی چاہیے۔ تعمیر کا مفہوم جامع ہے، جس کے دائرے میں آئین، دستور، سماج، قانون، نظامِ تعلیم اور ذرائع ابلاغ سب شامل ہیں۔ ان سب دائروں میں زندگی کی تعمیر اسلام کے مطابق ہو، اس پروگرام میں اب تک اسلامی تحریکوں کو زیادہ کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ تاہم دنیا اس پروگرام سے واقف ہے۔ مسلمان بھی جانتے ہیں کہ اسلامی تحریکیں یہ خاکہ لے کر سامنے آئی ہیں۔ پھر باخبر غیر مسلم اور دنیا کے مفسد عناصر بھی اس تصور سے واقف ہیں۔ اس صورت حال نے بعض سوالات پیدا کیے ہیں۔

دور جدید کے مسلمانوں نے جن بزرگوں کے لٹریچر سے استفادہ کیا ہے، ان میں سید قطب شہیدؒ بھی شامل ہیں۔ انھوں نے دعوت اسلامی کی ترتیب کے سلسلے میں اپنی یہ رائے بیان کی ہے کہ پہلے لوگوں کے دل اللہ کی حاکمیت کے آگے جھکنے چاہییں۔ (لوگوں سے مراد غیر مسلم اور مسلمان دونوں ہیں) سید قطب شہیدؒ کے تجزیے کے مطابق اللہ کی

حاکمیت کے تصور کو مسلمان بھی بھُلا چکے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ پہلے دلوں میں اللہ کی حاکمیت کا تصور راسخ اور مستحکم ہو جائے، اس کے بعد داعیان حق شریعت کی تفصیلات پیش کریں، اس سلسلے میں جس نئی تحقیق اور اجتہاد کی ضرورت ہو، وہ بھی انجام دیں۔ شریعت کی تشریح بہر حال بعد کا مرحلہ ہے۔ اس سے پہلے اللہ کی حاکمیت کا شعور عام ہونا ضروری ہے۔ اگر قبل از وقت کارکنانِ دعوت، کارِ اجتہاد میں لگ گئے اور اپنی توانائی کا ایک حصہ اس سوال کا جواب دینے میں لگایا کہ ملک کی تعمیرِ نو اسلام کے مطابق کیسے ہوگی، تو یہ اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہ ہوگا۔

سید قطب شہیدؒ نے جو رائے ظاہر کی تھی اس پر آدھی صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ اب اس رائے پر دوبارہ غور کرنا چاہیے۔ دنیا میں اسلامی تحریکوں کی بات اس وقت جتنی اجنبی تھی، اب اتنی اجنبی نہیں رہی اور عالم اسلام میں تعمیر نو کا آغاز بھی، (شیاطین عالم کی مزاحمت کے باوجود) ہو چکا ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلم ملکوں کے دستور، حکومتیں اور سماج، یہ سب اسلام سے یکسر بے نیاز ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کے خاصے اثرات انھوں نے قبول کیے ہیں۔ اور مزید اثرات مرتب ہونے کے روشن امکانات موجود ہیں۔ چنانچہ اب اس امر کی ضرورت ہے کہ اسلامی نظام کی تفصیلات بھی پیش کی جائیں۔ مثلاً واضح کیا جائے کہ سود کی حرمت پر مبنی اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ آج کی دنیا کے حالات، مسلمان ملکوں کی کیفیت اور تیسری دنیا کے احوال کے سیاق میں، تعمیرِ نو کی تفصیل سوچنے اور بیان کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ دعوتِ اسلامی کی تعارف کے وسیع ہونے کے ساتھ اسلام کے بارے میں اظہارِ خیال پر اب دنیا نے سوالات پیش کرنا شروع کر دیے ہیں۔ بعض سوالات سے مسلمان تعرض بھی کر رہے ہیں اور ان پر گفتگو کر رہے ہیں۔ تاہم گفتگو، بحیثیتِ مجموعی اطمینان بخش نہیں ہے۔

زیر بحث سوالات میں ایک اہم سوال اسلام کے تصورِ جہاد سے متعلق ہے۔ آج جہاد کو بحث اور اعتراض کا موضوع بنا دیا گیا ہے۔ اس کیفیت کا ردِّ عمل مسلمانوں کی طرف سے سامنے آیا ہے، وہ یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے جہاد کے لفظ کا استعمال ہی چھوڑ دیا ہے۔

اگر وہ بہ تکلف یہ اصطلاح استعمال بھی کرتے ہیں تو جہاد کے محض محدود معانی بیان کرتے ہیں اور یہ طرز گفتگو، دین میں تحریف کے مترادف ہے۔ جن مسلمانوں کا یہ ردعمل ہے، وہ یقیناً غیر معقول ہے۔ دوسرا ردعمل گفتگو کی شکل میں سامنے نہیں آتا بلکہ عملی شکل اختیار کرتا ہے۔ یعنی آج بعض مسلمانوں اور مسلمان گروہوں کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ، اُمتِ مسلمہ کی مظلومیت کے ازالے کے لیے نامناسب حرکتیں کررہے ہیں، جن کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ ان گروہوں کی طرف منسوب کی جانے والی باتوں میں کتنی صداقت ہے۔ اگر نامناسب حرکتیں فی الواقع کی جارہی ہیں تو یہ اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔ ان حالات میں سنجیدہ و مخلص اہلِ ایمان کی جانب سے جس درست ردعمل کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ داعیانِ حق، اسلام کی اصطلاحوں کا استعمال کسی تردد کے بغیر کریں۔ مثلاً جہاد کی اصطلاح بلاجھجک استعمال کریں بغیر تکلف کے، چاہے شرپسندوں کو یہ طرزِ کلام کتنا ہی ناگوار گزرے۔ جہاد کی صحیح تشریح بہرحال اہل ایمان کو پیش کرنی چاہیے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک صدی پہلے یہ کام انجام دیا تھا۔ ہمیں اطمینان ہے کہ مولانا نے جو بات اپنی تصنیف 'الجہاد فی الاسلام' میں کہی تھی، وہ بالکل صحیح ہے اور اسلام کی صحیح ترجمانی ہے۔ اہلِ علم اور محققین اس کا مطالعہ کرکے اپنا اطمینان کرسکتے ہیں۔ تاہم اسلامی اصطلاحات کے تعارف کے لیے محض ایک کتاب کافی نہیں ہے، بلکہ اسلامی موضوعات پر تحقیق اور تفصیلی تصنیفات کی ضرورت ہے۔ اسلام کا تصور جہاد، دورجدید میں اس کے تقاضے، شرائط، حدود اور آداب کو دنیا کے سامنے آنا چاہیے۔ مسلمانوں کو ان تفصیلات سے واقف کرانا چاہیے اور غیر مسلموں کو بھی۔

دعوت کی ترتیب کا لحاظ اصولاً صحیح ہے جب ہم اسلام کا تعارف کرائیں گے، تو پہلے قدم پر اسلام کی تفصیلات بیان کرنا مناسب نہیں۔ پہلے اساسی امور یعنی توحید، رسالت اور آخرت کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ لیکن جب فضا میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں سوالات اٹھ چکے ہوں اور لوگ ان کے جوابات جاننا چاہتے ہوں، تو پھر یہ ضروری ہے کہ ان سوالات پر براہِ راست گفتگو کی جائے۔ ان موضوعات کی نمایاں مثال جہاد کا موضوع ہے۔

مسلمانوں کی کیفیت

دعوت کے نکات اور اسلام کے سلسلے میں پوچھے جانے سوالات کے علاوہ، خود یہ موضوع بھی قابل غور ہے کہ آج کی دنیا میں دعوت دینے والوں کا (یعنی امت مسلمہ کا اور اسلامی تحریکوں کا) کیا حال ہے؟ ان کی کیا کیفیت ہے؟ ان کی کیفیت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں۔ ان سے تعرض نہ کرتے ہوئے صرف اس پہلو پر ہمیں توجہ کرنی چاہیے کہ جو سوالات دنیا میں اٹھتے ہیں، ان سے مسلمان خود کیا اثر لیتے ہیں؟ مثلاً ایک غیر مسلم جہاد کو نہیں جانتا۔ غلط فہمی کی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ جہاد ظلم وستم کا نام ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کیفیت سے ہم مسلمان بھی متاثر ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں واقعی جہاد ظلم کا نام تو نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمان خود بھی نہیں جانتے کہ جہاد کی معنویت کیا ہے؟ تو محض بات اتنی نہیں ہے کہ ہمارا مخاطب کچھ باتیں پوچھ رہا ہے اور داعیانِ حق کو کچھ باتیں اسے بتانی ہیں۔ بلکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ امت مسلمہ کے اندر ایمان، علم اور یقین کی مطلوبہ کیفیت میں کمی آچکی ہے۔ فضا میں گونجنے والے سوالات نے ان کی فکر وفہم کو متاثر کر دیا ہے۔ چنانچہ اسلام پر یقین کی کیفیت کو بحال کرنا، باشعور عناصر کی ذمہ داری ہے۔ اس بنا پر بھی ضروری ہے کہ عصر حاضر کے سوالات سے تعرض کیا جائے، غیر مسلموں سے پہلے خود مسلمانوں کا دین پر اطمینان ضروری ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس دین پر وہ ایمان لائے ہیں اس نے کوئی تعلیم ایسی نہیں دی ہے، جو غیر معقول ہو، جو انسانیت کے خلاف ہو، جو انصاف کے خلاف ہو اور جو ظلم پر مبنی ہو۔ سب سے پہلے امت مسلمہ کا دینِ حق پر اطمینان اور یقین بحال ہونا چاہیے اور اس کے لیے مسلم عوام وخواص کے درمیان تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

دنیا کے ہر کام کی طرح دعوت اسلامی کا کام بھی تیاری چاہتا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ تیاری کے اعتبار سے دعوت دینے والوں کی کیا کیفیت ہے؟ دعوت کو مؤثر بنانے کے لیے علم وتحقیق بھی درکار ہے۔ دنیا میں جو کچھ پوچھا جا رہا ہے، اس کا معقول، محققانہ، علم واستدلال

پر مبنی جامع جواب، اچھی پیش کش کے ساتھ اہلِ حق فراہم کریں۔ مسلمانوں کو خصوصاً ان کے نوجوانوں کو بتائیں اور غیر مسلم دنیا کو بھی بتائیں۔

البتہ مؤثر دعوت کے لیے محض علمی تیاری کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسرے پہلوؤں پر توجہ بھی درکار ہے۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ داعی کا اللہ سے گہرا تعلق ہو۔ اللہ سے مطلوب تعلق کا اعلیٰ ترین نمونہ انبیاء علیہم السلام کی زندگیاں ہیں۔ اس تعلق باللہ کی جھلک، اس کیفیت کا پرتو، امت مسلمہ کے افراد اور اسلامی تحریکوں کے وابستگان میں نظر آئے، تبھی وہ داعی الی اللہ کی پوزیشن میں ہوسکتے ہیں، تب ان کی زبان میں تاثیر ہوگی۔ وہ تقریر کریں گے تو لوگ متاثر ہوں گے، وہ کوئی بات کہیں گے تو غور سے سنی جائے گی، ان کی بات دلوں میں اترے گی، محض علمی تیاری سے یہ کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی، دعوت کے لیے ربِ کائنات سے زندہ تعلق درکار ہے۔ اللہ سے تعلق کے استحکام کی طرف مسلمانوں کو توجہ کرنی چاہیے۔ اللہ سے تعلق کی کیفیت آج بھی دنیا کے ہر معاشرے سے بڑھ کر مسلمان معاشرے میں پائی جاتی ہے، اس کیفیت کو زیادہ زندہ، زیادہ متحرک اور زیادہ توانا بنانے کی ضرورت ہے۔

عملی شہادتِ حق

مخلص داعی اپنے پورے وجود سے دین کی دعوت دیتا ہے۔ وجود سے مراد صرف ایک شخص کا وجود نہیں ہے، بلکہ پوری امتِ مسلمہ کا اجتماعی وجود بھی ہے۔ جائزہ لینا چاہیے کہ امتِ مسلمہ مجموعی طور پر کیا کہتی ہے؟ مسلمان دعوت کے عنوان سے کوئی جلسہ کریں اور اسلام کا تعارف کرائیں تو یہ مسلمانوں کے جلسوں کا اور باتوں کا چھوٹا سا جز ہوگا۔ لوگ محض اس جلسے سے اثر نہیں لیں گے، بلکہ یہ بھی دیکھیں گے کہ دیگر مواقع پر، مسلمان کیا باتیں کرتے ہیں؟ جب ملک کے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟ کیا فکر پیش کرتے ہیں اور کس نظریہ کا حوالہ دیتے ہیں؟ جب مسلمانوں کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہیں، تب کس بنیاد پر گفتگو کرتے ہیں؟ جب کوئی ڈیلیگیشن (وفد) لے کر حکومت کے لوگوں سے ملنے جاتے ہیں تو کیا اسلام پر گفتگو بھی کرتے ہیں؟ یا محض اپنے مسائل بیان کرتے ہیں؟ کیا

مسلمان اسلامی فکر ونظریہ کا بھی حوالہ دیتے ہیں؟ کیا اُن کی گفتگو سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اللہ کو ماننے والے لوگ ہیں؟ یہ سب، مسلمانوں کے اجتماعی وجود کے پہلو ہیں۔ جب مسلمان حالات ومسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو دنیا اس کو غور سے سنتی ہے۔ دعوتی تقریر تو ایک آدھ سن لیتی ہے۔ اصلاً اس کی توجہ مسلمانوں کے مطالبات، ان کے موقف اور مسلمانوں کی تنظیموں کی قراردادوں، انجمنوں اور پارٹیوں کی کارروائیوں پر ہوتی ہے۔ ان کی کارکردگی اور سرگرمیاں، ان کے جلسے، پورے امت مسلمہ کے مشاغل، یہ زیادہ واضح زبان میں مسلمانوں کے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔ محض چند دعوتی تقریریں ان سب کے مقابلے میں زیادہ اثر نہیں ڈال سکتیں، اگر ان دیگر سرگرمیوں کا رنگ دوسرا ہو۔

دعوت اسلامی کا حق ادا کرنا ہے تو امت مسلمہ کے پورے وجود کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ محض جماعت اسلامی کے نام کی ایک تنظیم کا وجود کافی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کی ہر تنظیم اسلام کی نمائندہ ہو۔ اُن کا ہر جلسہ اسلام کا ترجمان ہو، ہر ادارہ اسلامی قدروں کا آئینہ دار ہو۔ جب امت کا وجود ایسا ہوگا، تب یہ توقع کر سکتے ہیں کہ دنیا میں دعوت دین کا کام ہوگا۔ یہ بہت بڑا چیلنج ہے جو اہلِ حق کے سامنے ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی تقریر ’شہادتِ حق‘ میں اس جانب توجہ دلائی ہے۔ مسلمانوں کو دنیا میں عملی شہادت دینی ہے، یہ شہادت امت کے اجتماعی عمل سے دینی ہے۔ عملی شہادت صرف ایک فرد کے عمل کا نام نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اجتماعی عمل کا نام ہے۔ اگر مسلمان اجتماعی عمل کو درست کر لیں، تو دعوت دین کے کام میں تیزی آسکتی ہے اور حق کی روشنی دنیا میں پھیل سکتی ہے۔

اسلامی اصطلاحیں

داعیانِ حق کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ گفتگو میں دینی اصطلاحیں استعمال کریں۔ اس کا التزام مشکل ہے۔ یہ کام علمی تیاری اور محنت چاہتا ہے۔ مسلمانوں کی مستند، دینی اصطلاحوں میں گفتگو اس دشواری کو بھی حل کرتی ہے، جس کا اس سے قبل ذکر کیا گیا تھا۔ دشواری یہ تھی کہ ہر باطل نظریہ کچھ صداقت کا عنصر بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ مثلاً کمیونزم میں

کچھ صداقت کے اجزاء موجود ہیں، اگر آپ کمیونزم کی کلی تردید کریں تو یہ مشکل کام ہے۔اسی طرح سیکولرزم میں بعض صداقت کے پہلو بھی موجود ہیں، اس کی کلی تردید مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دشواری کا خاصا احساس ہے۔اسی طرح کا معاملہ کثرتیت (Pluralism) اور دوسرے نظریات کا ہے۔ ہر نظریہ انسان کی بعض حقیقی ضرورتوں کے جواب میں دنیا کے سامنے آتا ہے۔ اس لیے صداقت کا کچھ نہ کچھ جز اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر مسلمان دینی اصطلاحوں میں بات نہیں کریں گے، تو اپنے موقف کو نہیں سمجھا سکیں گے۔ کسی رائج مغربی اصطلاح کی تائید کریں یا تردید، دونوں صورتوں میں مسلمانوں کا موقف واضح نہیں ہوتا اور دعوت اسلامی کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مثلاً پلورزم کی کلی تائید اور پلورزم کی یکسر تردید، دونوں اسلامی موقف کی درست ترجمانی نہیں ہیں۔ اس معاملے میں اسلام کا اپنا موقف ہے کہ جو انسان ایک جگہ رہتے ہوں مگر ان کے الگ الگ مذہب ہوں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ کیا معاملہ کریں؟ اس سوال کے جواب میں اسلام اپنا متعین نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اسے اسلام ہی کی اصطلاحوں میں بیان کرنا چاہیے۔

اِس بنا پر ضروری ہے کہ مسلمان ضروری علمی تیاری کریں اور یہ حوصلہ پیدا کریں کہ کہ دنیا کو اسلام کی اصطلاحوں سے روشناس کرائیں گے۔ داعیانِ حق دینی اصطلاحوں میں گفتگو کرنا سیکھیں اور دلائل فراہم کر کے حق کی دعوت کے ساتھ دنیا کے سامنے آئیں۔ اسلامی اصطلاحوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں صداقت ہی صداقت ہے، باطل کی کوئی آمیزش نہیں ہے، ان اصطلاحات میں کوئی اندرونی تضاد نہیں ہے۔ جب مسلمان اسلامی اصطلاحوں میں گفتگو کرتے ہیں تو مکمل حق انسانوں کے سامنے آتا ہے۔ اس حق کو پیش کرنا چاہیے۔ یہ انسانیت کی حقیقی ضرورت ہے۔ اس طرح مغربی اصطلاحوں کے فریب سے دنیا کو نجات مل سکے گی۔

مومن کی نظر چاہیے، حق بیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانشِ افرنگ

☆☆☆

دعوت و جہاد اور اسوۂ نبوی

انسانیت کی ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے پیغمبروں کے بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا جو آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت پر مکمل ہوا۔ پیغمبروں کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ انسان غفلت اور شرارت سے جس راہِ ہدایت کو گم کر دیا کرتے تھے وہ دوبارہ اُن کے سامنے واضح کر دی جائے تاکہ حجت تمام ہو جائے اور اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے بھٹکنے والے کوئی عذر پیش نہ کر سکیں۔ قرآن مجید نے اس تاریخی حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔

انبیاءِ کرام کی بعثت

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۖ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (البقرۃ: ۲۱۳)

”ابتدا میں سارے انسان ایک ہی طریقے پر تھے۔ (یعنی اُس راہِ حق پر جو ابتدا میں اُن کے خالق نے اُن کو بتادی تھی۔ پھر یہ حالت باقی نہ رہی۔ لوگ ہدایت کو بھلا بیٹھے اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے

والے اور (کج روی کے برے نتائج سے) ڈرانے والے تھے، اور اُن (نبیوں) کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوگئے تھے، اُن کا فیصلہ کرے — (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا — نہیں) اختلاف اُن لوگوں نے کیا، جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے، انھیں اللہ نے اپنے اِذن سے اُس حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے، راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

انسانوں میں راہِ حق کے بارے میں اختلاف کے دو اسباب ہوسکتے ہیں۔ ایک سبب ناواقفیت ہے۔ اگر اللہ کی ہدایت گم ہوگئی ہو تو لوگوں کے پاس راہِ حق کو جاننے کا کوئی یقینی ذریعہ ہی موجود نہیں ہوتا۔ یہ سبب ایسا ہے جس کی موجودگی میں، اِدھر اُدھر بھٹکنے والے انسان — ایک حد تک — اپنی گم راہی کے لیے معذور ہوتے ہیں۔ جب کتابِ الٰہی — تحریف سے پاک شکل میں — دنیا میں موجود ہی نہ ہو تو انسان یہ عذر پیش کرسکتا ہے کہ حق معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ اس کے پاس نہ تھا۔ پیغمبروں اور کتاب کی آمد سے، انسانوں کی گم راہی کا اور اُن کے اختلافات کے شکار ہونے کا یہ سبب (یعنی ناواقفیت کا سبب) دور ہوجاتا ہے۔ وہ ناواقف نہیں رہتے بلکہ راہِ ہدایت سے واقف ہوجاتے ہیں۔ درج بالا آیت کا پس منظر یہی ہے۔ انسانی اختلافات کا دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض لوگ، ہدایت سے واقف تو ہوتے ہیں لیکن راہِ ہدایت کو اس لیے قبول نہیں کرتے کہ وہ دوسرے انسانوں پر زیادتی کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے بڑے بننا چاہتے ہیں۔ اختلافات کے اس سبب کو مکمل طور پر دور کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ نے اس دنیا کی آزمائشی زندگی کی حد تک — انسان کو آزادی دی ہے — انسان چاہے تو نبیوں کی تعلیم کو مان سکتا ہے اور چاہے تو اس کا انکار بھی کرسکتا ہے۔ انکار کی سزا اسے آخرت میں ملے گی، مگر اس دنیوی زندگی میں بہرحال وہ انکارِ حق کی آزادی رکھتا ہے۔ نبیوں کا کام صرف اتنا ہے کہ حق اور ہدایت کو اس طرح انسانوں

کے سامنے واضح کر دیں کہ کوئی شخص، اپنی گم راہی کے لیے، ناواقفیت کا عذر پیش نہ کر سکے۔

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ۝ (الغاشیہ:۲۱-۲۶)

''پس (اے نبیؐ!) نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔ البتہ (واضح رہے کہ) جو شخص منہ موڑے گا اور (حق کا) انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔ ان لوگوں کو پلٹنا ہماری ہی طرف ہے، پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے۔''

انکارِ حق پر دُنیا میں گرفت

انبیاء علیہم السلام کو اللہ نے یہ کام سپرد کیا کہ وہ انسانوں کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ انسانوں کو راستی اور حق سے واقف کرانے اور راہِ ہدایت کی طرف بلانے کے لیے نبیوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ پیغامِ حق پہنچانے اور نصیحت وتلقین کرنے کا تھا۔ ضرورت پڑنے پر اس کی بھی اجازت دی گئی کہ مخاطبین سے اچھے طریقے سے، بحث و مباحثہ (مجادلہ) کیا جائے۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت دی گئی:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝ (النحل:۱۲۵)

''(اے نبیؐ!) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔''

عملاً رسولوں کی دعوت کے جواب میں ہوا یہ کہ کچھ حق پسندوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا۔ اس کے برعکس کچھ نادانوں نے حق کو قبول نہیں کیا البتہ مخالفت بھی نہیں کی۔ کچھ

شر پسندوں نے محض انکار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رسولوں کی دعوت کی مخالفت شروع کر دی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حق کا اقرار یا انکار کرنے کے بجائے محض صورتِ حال کا مشاہدہ کر رہے تھے اور شاید اپنے انتخاب کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ حق کے علم برداروں اور اس کے مخالفین کی باہم کشمکش کا کیا نتیجہ سامنے آتا ہے! دعوتِ اسلامی کے ظہور کے بعد جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور اس مخالفت میں اس حد تک بڑھے کہ رسول اور داعیانِ حق کو اپنی بستی سے نکالنے پر تُل گئے، اُن کے بارے میں قرآن یہ بتاتا ہے کہ اسی دنیا میں اللہ کی جانب سے، اُن کی گرفت ہوئی۔ چنانچہ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا گیا:

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ○ (بنی اسرائیل: ۷۶، ۷۷)

’’اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد، یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔ (یہ معاملہ محض تمہارے ساتھ نہیں ہے بلکہ) یہ ہمارا مستقل طریقِ کار ہے جو اُن سب رسولوں کے بارے میں ہم نے برتا ہے، جنھیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا، اور ہمارے طریقِ کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔‘‘

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ○ وَ اسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ○ (ابراہیم: ۱۳-۱۵)

’’آخر کار کفر کرنے والوں نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں ہم اپنے ملک سے نکال دیں گے۔ تب اُن کے رَب نے اُن پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور اُن کے بعد تمہیں زمین

میں آباد کریں گے۔ یہ انعام ہے اُس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔ انھوں نے فیصلہ چاہا تھا تو (یوں اُن کا فیصلہ ہوا اور) ہر جبّار، دشمنِ حق نے منہ کی کھائی۔''

قرآن مجید بتاتا ہے کہ رسول کی آمد، کسی گروہ کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ رسول کے انکار کی صورت میں اس گروہ کو اللہ کا عذاب، اسی دنیا میں آلیتا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ○ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ○

(یونس:۴۷۔۵۰)

''ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی اُمت کے پاس اُس کا رسول آجاتا ہے تو اس کا فیصلہ، پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔ کہتے ہیں کہ اگر تمہاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہوگی؟ کہو: میرے اختیار میں تو خود اپنا نفع وضرر بھی نہیں، سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے۔ جب وہ مدت پوری ہوجاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم وتاخیر بھی نہیں ہوتی۔ اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذب اچانک رات یا دِن کو آجائے (توتم کیا کر سکتے ہو)، آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے، جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں۔''

اللہ کی سنت کی معنویت

قانونِ الٰہی یہ ہے کہ رسولوں کا انکار کرنے والے اور اُن کی دعوت کی راہ میں روڑے اٹکانے والے، اسی دنیا میں اللہ کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قانونِ الٰہی کی حکمت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسانوں پر حجت تمام کرنا اور

حق کو اچھی طرح واضح کر دینا، اللہ کے رسولوں کی آمد کا مقصد ہے۔ یہ مدعا اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب دلائل کے ذریعے بھی حق کا حق ہونا واضح ہو جائے اور عالمِ واقعہ میں باطل کی عملاً شکست کے ذریعے بھی، باطل کا غلط، بے بنیاد اور تباہ کن ہونا واضح ہو جائے۔ جب تک عالمِ واقعات میں حق اور باطل کی کش مکش کا نتیجہ، حق کی فتح کی صورت میں نہیں نکلتا، بہت سے انسان، تذبذب کا شکار رہتے ہیں۔ ذہنی افق کی تنگی، حق شناسی کی لذت سے نا آشنائی، جرأت کی کمی اور کردار کی پستی اُن کو حق قبول کرنے سے اور حق کو پہچاننے سے باز رکھتی ہے۔ عامۃ الناس کی آنکھیں کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ غلبۂ حق، اُن کو اُن کی نظروں کے سامنے واقعے کی صورت میں نظر آئے۔ قرآن مجید بتاتا ہے کہ حق کی فتح کے بعد، انسان بڑی تعداد میں اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہیں:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ○ (النصر)

''جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور تم دیکھ لو کہ لوگ، فوج در فوج، اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اُس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

اسی لیے اہلِ ایمان، دنیا میں حق کی فتح کو محبوب رکھتے ہیں:

وَّاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الصف:۱۳)

''(تمھارے ایمان و جہاد کے نتیجے میں اللہ) وہ دوسری چیز بھی تمھیں دے گا، جسے تم چاہتے ہو۔ یعنی اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبی! اہلِ ایمان کو اس فتح کی خوش خبری دے دو۔''

دلائل کے ذریعے حق کی وضاحت کے ساتھ، جب عملاً حق کے غلبے کے ذریعے بھی سیدھے راستے کی حقانیت ظاہر ہو جائے تو اس کیفیت کو 'اظہارِ دین' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس لیے تشریف لائے کہ پورے طور پر دین کا اظہار ہو سکے:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ

لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (التوبہ:۳۲،۳۳)

''(منکرینِ حق) چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں لیکن اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر نہیں رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اُسے پورے دین پر ظاہر کردے، خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔''

مخالفت کی نوعیت

دنیا میں جب دعوتِ حق پیش کی جاتی ہے تو بعض شر پسند اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ حق کی طرف بلانے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں، اُن کو برا بھلا کہتے ہیں، نامعقول سوالات کرتے ہیں اور دعوت کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ جب ان طریقوں سے وہ دعوتِ حق کو نہیں روک پاتے تو حق پیش کرنے والوں اور اُسے قبول کرنے والوں کو دھمکیاں دیتے ہیں، اُن کو تنگ کرتے ہیں، اُن پر ظلم ڈھاتے ہیں اور بس چلے تو انھیں اپنی بستی سے نکال دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ حق پرستوں کو سزائیں دی جاتی ہیں، اُن کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے، انھیں جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے۔

جب اہلِ کفر و شرک کے درمیان رسول کی سربراہی میں دعوتِ حق پیش کی جارہی ہوتی ہے تو قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ مذکورہ بالا ساری مخالفت کے باوجود زمین پر حق غالب ہوجاتا ہے اور منکرینِ حق، اللہ کے عذاب کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ اس موضوع پر غور کرتے وقت یہ سوال ہمارے آتا ہے کہ دعوتِ حق کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے، کیا داعیانِ حق کو بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہے یا اس سلسلے میں انھیں محض مشیتِ الٰہی کے حرکت میں آنے کا انتظار کرنا چاہیے؟ اس سوال کا جواب، قرآنِ مجید میں تلاش کیا جائے تو یہ جواب ملتا ہے کہ حق کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے، اہلِ ایمان اور داعیانِ حق کو بھی، اپنا فرض انجام دینا چاہیے۔ یہ رکاوٹیں تین طرح کی ہوسکتی ہیں: حق کی

طرف بلانے سے روکا جائے، حق کو قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جائے یا حق پر عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ رکاوٹ کی نوعیت جو بھی ہو، اس کا مقابلہ کرنے اور اس پر قابو پانے کی سعی، ایمان کا تقاضا ہے۔ راہِ حق میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کو، اسلامی اصطلاح میں جہاد کہا جاتا ہے۔

قرآن کے ذریعے جہاد

جہاد کا ایک مرحلہ 'جہاد بالقرآن' ہے یعنی قرآن کو لے کر جہاد۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خطاب کر کے فرمایا ہے:

وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا۝ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۝ (الفرقان:۵۱-۵۲)

''اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے۔ پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر اُن کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔''

دعوتِ حق کے راستے میں بعض رکاوٹیں، نامعقول سوالات، جھوٹے پروپیگنڈے اور فریب کن باتوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ اُن رکاوٹوں کا مقابلہ قرآن مجید کو انسانوں کے سامنے لا کر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید سوالات کا تشفی بخش جواب دیتا ہے، جھوٹ کے بے بنیاد ہونے کا آشکارا کرتا ہے اور فریب کے پردوں کو چاک کر دیتا ہے۔ اس طرح رکاوٹیں دور ہوتی ہیں اور انسانوں کا حق کی طرف آنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ جہاد بالقرآن ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جہادِ کبیر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہادِ کبیر کے تین معنی ہیں: ایک، انتہائی کوشش، جس میں آدمی، سعی و جاں فشانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ دوسرے، بڑے پیمانے پر جدوجہد، جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لا کر ڈال دے۔ تیسرے، جامع جدوجہد، جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے۔'' (تفہیم القرآن، الفرقان، حاشیہ ٦٧)

البتہ یہ ظاہر ہے کہ راہِ حق میں ڈالی جانے والی ہر قسم کی رکاوٹوں کا مقابلہ محض جہاد بالقرآن سے نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سی رکاوٹیں ایسی ہیں جن کا مقابلہ طاقت سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اسلام نے جہاد کی دیگر شکلوں کی بھی اجازت دی ہے تا کہ حق کو پھیلانے، اُسے قبول کرنے اور ہدایتِ الٰہی پر عمل کرنے کی فطری آزادی، انسانوں کو حاصل رہے۔ البتہ جہاد اُن شرائط اور آداب کے ساتھ ہی کیا جاسکتا ہے جو اسلام نے بتائے ہیں۔ اصلاً جہاد کے لیے اسلام کی بنیادی ہدایات دو ہیں جو تمام شرائط اور آداب کا خلاصہ ہیں۔ یعنی فساد فی الارض سے بچا جائے اور معاہدوں اور عہد و پیمان کی پابندی کی جائے۔ ان ہدایات کی تفصیلات قرآن مجید، حدیث، سیرت اور فقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اللہ کے راستے میں جہاد کا مدعا

اصطلاحاً جہاد کی دوسری شکل کے معنی ہیں، (اسلامی آداب و شرائط کے تحت) اللہ کی راہ میں طاقت کا استعمال، تا کہ راہِ حق میں ڈالی جانے والی رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے۔ قرآنِ مجید نے جہاد کا مقصد اس طرح بیان کیا ہے:

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرۃ: ۱۹۳)

”تم اُن سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہوجائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا، اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کا مقصود، فتنے کا خاتمہ ہے۔ اس اصطلاح (فتنہ) کا مفہوم بیان کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

”فتنے کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، جس میں انگریزی کا لفظ Persecution استعمال ہوتا ہے، یعنی کسی گروہ یا شخص کو محض اس بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنانا کہ اُس نے رائج الوقت خیالات و نظریات کی جگہ، کچھ دوسرے خیالات و نظریات کو حق پا کر قبول کرلیا ہے اور تنقید و تبلیغ کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجود الوقت نظام میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ بلاشبہ انسانی خون بہانا بہت برا فعل ہے، لیکن جب کوئی

انسانی گروہ زبردستی اپنا فکری استبداد دوسروں پر مسلط کرے اور لوگوں کو قبولِ حق سے بہ جبر روکے اور اصلاح وتغیر کی جائز ومعقول کوششوں کا مقابلہ، دلائل سے کرنے کے بجائے حیوانی طاقت سے کرنے لگے، تو وہ قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے گروہ کو بزورِ شمشیر ہٹا دینا بالکل جائز ہے۔''

(تفہیم القرآن، سورۃ بقرۃ، حاشیہ ۲۰۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ فتنے کے معنی ہیں: ''اللہ کے راستے سے جبراً لوگوں کو روکنا، اور حق قبول کرنے والوں کو اس سے پھر جانے پر مجبور کرنا۔'' یہ فتنہ اتنا بڑا شر ہے کہ اس کو ختم کرنے کے لیے جنگ بھی درست ہے۔ 'فتنے' کے درج بالا مفہوم کی تائید قرآن مجید کی متعدد آیات سے ہوتی ہے۔ مثلاً:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرۃ:۲۱۷)

''لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اِس میں لڑنا بہت برا ہے، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ (خدا پرستوں پر) بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور فتنہ، قتل سے شدید تر ہے۔ وہ (کافر) تو تم سے لڑہی جائیں گے، حتیٰ کہ اگر اُن کا بس چلے، تو تمھیں اس دین سے پھیر لے جائیں (اور یہ خوب سمجھ لو کہ) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا، اس کے اعمال، دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔''

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النحل:۱۱۰)

''جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ ستائے گئے (فتنے میں مبتلا کیے گئے) تو انھوں نے گھر بار چھوڑ دیے، ہجرت کی، راہِ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا، اُن کے لیے یقیناً تیرا رب غفور ورحیم ہے۔''

قرآن مجید میں ان آیات کی موجودگی کے باوجود آج کل بعض لوگوں نے یہ عجیب وغریب بات کہنی شروع کر دی ہے کہ جہاد، صرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض تھا۔ آپ کے بعد عام مسلمان، محض اپنے جان و مال کے دفاع کے لیے طاقت کا استعمال کر سکتے ہیں، دنیا سے فتنے کو مٹانے کے لیے جہاد کرنا، اُن پر فرض نہیں رہا۔ ایسی رائے رکھنے والوں کو قرآن مجید کی درجِ ذیل آیت پر غور کرنا چاہیے جس میں تمام اہلِ ایمان سے جہاد کے لیے کہا گیا ہے، (محض نبی سے نہیں)۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰـكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰـكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللهِ ؕ هُوَ مَوْلٰـكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (الحج:۷۸)

''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے)۔ تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم انسانوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولا۔ بہت ہی اچھا ہے وہ مولا اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔''

اقدام یا دفاع

یہ سوال اکثر کیا جاتا ہے کہ ''جہاد، دفاعی ہے یا اقدامی؟'' یہ سوال چونکہ نامکمل شکل

میں کیا جاتا ہے اس لیے مغالطہ آمیز ہے۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ ایمان لانے والوں کا کام حق پر خود عمل کرنا اور دنیا کے سامنے حق کا اظہار کرنا ہے تا کہ ہدایت کے طالبین، ہدایت سے محروم نہ رہیں۔ اظہارِ دین کا یہ کام دعوت اور جہاد کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ دونوں کام لازم وملزوم ہیں۔ ذہنوں پر گم راہی کے غلبے کو مٹانے کا کام، دعوت کے ذریعے ہوتا ہے۔ اگر دعوت کے اس کام میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے تو طاقت کے ذریعے جہاد کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ البتہ اگر حق کی طرف بلانے، حق کو اختیار کرنے یا احکامِ الٰہی پر عمل کرنے میں رکاوٹ ڈالی جائے تو ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے جہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دعوت، ایک اقدامی عمل کا نام ہے۔ اہلِ ایمان یہ اقدام، اس لیے کرتے ہیں تا کہ حق واضح ہوجائے اور باطل کے فریب سے لوگ دھوکا نہ کھائیں۔ جہاد، اس پہلو سے اقدامی ہے کہ وہ دعوت کی راہ کی رکاوٹیں دور کرتا ہے اور خود دعوت، ایک اقدامی سرگرمی ہے۔ جہاد، اس پہلو سے دفاعی ہے کہ اُس کے ذریعے، انسان کی قبولِ حق کی آزادی کی حفاظت مقصود ہے، (اگر اس آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کی جارہی ہو۔) چنانچہ جہاد ایک ایسا عمل ہے، جو بیک وقت اقدامی بھی ہے اور دِفاعی بھی۔

تاہم عملاً جہاد اُسی وقت ہوسکتا ہے جب اُس کی شرائط پوری ہوتی ہوں اور اُس کے آداب کا لحاظ رکھا جاسکتا ہو۔ بصورتِ دیگر محض دعوتی سرگرمیوں پر اکتفا ضروری ہے۔

رکاوٹوں کو دور کرنے کی سعی

مکّہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعوتِ عام کا فریضہ انجام دیا۔ اپنے قیامِ مکہ کے دوران ایک مرحلے میں آپ طائف تشریف لے گئے کیونکہ مکہ میں تبلیغِ حق جاری رکھنے کے مواقع کم سے کم تر ہوتے جارہے تھے۔ آپ ایسی بستی کی تلاش میں تھے جہاں آپ کو دعوت حق جاری رکھنے کے مواقع مل سکیں۔ طائف کے اس سفر میں آپ کو سخت آزمائش سے دوچار ہونا پڑا اور جو تائید آپ چاہتے تھے وہ نہ مل سکی۔ مکہ واپسی پر آپ اس پوزیشن میں نہ تھے کہ بطورِ خود شہر میں داخل ہوسکیں۔ چنانچہ آپ نے مطعم بن عدی سے پناہ کے لیے کہا۔ مطعم بن عدی

نے آپ کو پناہ دینے کے لیے آمادگی ظاہر کی تب آپ مکہ میں داخل ہوئے۔

مکہ میں مخالفینِ حق نے دعوتِ اسلامی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالیں اور کمزور مسلمانوں کو جس طرح تنگ کیا، اس صورت حال کے مقابلے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند اقدامات کیے:

(الف) صاحبِ حیثیت اصحاب کو آمادہ کیا کہ وہ غلام جو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ستائے جا رہے تھے، اُن کو خرید کر آزاد کر دیں تا کہ وہ کافروں کے جبر و ظلم سے نجات پا سکیں۔

(ب) اپنے اصحاب کے درمیان مواخات کرائی تا کہ وہ سخت حالات میں ایک دوسرے کی خبر گیری اور مدد کر سکیں۔

(ج) مسلمانوں کو اجازت دی کہ ایمان بچانے کے لیے حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔

(د) مکہ کے قیام کے آخری دور میں آپ نے متعدد قبائل سے ملاقاتیں کیں۔ آپ جس قبیلے سے ملتے، اُس سے یہ فرماتے کہ "مجھے اپنے ہاں پناہ دو اور میری حمایت کرو تا کہ میں اپنے رَب کا کلام پہنچاؤں"۔ اس سلسلے میں جن قبائل سے آپ نے رابطہ قائم کیا اُن میں قابلِ ذکر یہ ہیں:

کندہ، کلب، بنی بکر بن وائل، بنی البکاء، ثعلبہ بن عکابہ، بنی شیبان بن ثعلبہ، بنی الحارث بن کعب، بنی حنیفہ، بنو سلیم، بنی عامر بن صعصعہ، بنی عبس، بنی عذرہ، غسان، زارہ، بنی عبداللہ، بنی محارب بن خصفہ۔ (سیرت سرورِ عالمؐ، از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ۵۵۱/۲، ۵۵۲)

(ہ) ان سب اقدامات کے بعد آپ کا جو اقدام فیصلہ کن ثابت ہوا وہ مدینے کے قبیلے خزرج کے ایک گروہ سے، آپ کی ملاقات تھی جو بعثت کے گیارہ سال بعد عقبہ کے قریب ہوئی۔ اس ملاقات کا نتیجہ پہلی بیعتِ عقبہ کی شکل میں سامنے آیا۔ مزید ایک سال بعد دوبارہ عقبہ کے مقام پر مدینے کے بارہ نمائندے، آپ سے آ کر ملے۔ ان لوگوں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعت لی۔ پھر آپ نے مصعب بن عمیرؓ کو مدینے

بھیجا تا کہ اسلام کی عام تبلیغ کریں، ایمان لانے والوں کو قرآن کی تعلیم دیں، اُن کو اسلامی احکام بتائیں اور اُن کے اندر دین کی سمجھ پیدا کریں۔

(و) دوسری بیعت کے ایک سال بعد، حج کے زمانے میں ستر آدمی مدینے سے آئے اور عقبہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملے۔ آپ کو مدینے آنے کی دعوت دی اور آپ کی سچی وفاداری کا عہد کیا۔ یہ عقبہ کی آخری بیعت تھی۔

(ز) اس بیعت کے بعد آپ نے مکّے کے مسلمانوں کو عام حکم دے دیا کہ مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں تا کہ مدینہ، فی الواقع دارالاسلام بن سکے۔

(ح) سب سے آخر میں خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ آپ کا یہ سفرِ ہجرت، بعثت کے چودہ سال بعد (ماہِ صفر میں) ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس سفر میں آپ کے ساتھی تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ان اقدامات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مکہ میں آپ محض دین کی تبلیغ نہیں کررہے تھے بلکہ اُن سب رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے تدابیر بھی اختیار کررہے تھے، جو حق اور دعوتِ حق کے راستے میں حائل تھیں۔ اس کے ساتھ، آپ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے اقدامات کررہے تھے اور اُن کو زیادتیوں سے بچانے کی تدبیریں کررہے تھے۔ سب سے زیادہ جس امر پر آپ کی توجہ مرکوز تھی وہ ایسے گروہ کی تلاش تھی جو آپ کی تائید وحمایت کے لیے آمادہ ہوتا کہ آپ اپنے رب کا پیغام، انسانوں تک پہنچا سکیں، اس لیے کہ مکہ میں تبلیغ ودعوت کی راہیں تقریباً مسدود کی جاچکی تھیں۔

قیامِ مکہ کے دوران راہِ حق میں ڈالی جانے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنگی اقدام نہیں کیا، اس لیے کہ اللہ کی طرف سے آپ کو اس کی اجازت نہیں ملی تھی بلکہ کہا گیا تھا کہ ”کفوا ایدیکم“ (یعنی اپنے ہاتھ روکے رکھو)۔ اس ہاتھ روکے رکھنے کا تذکرہ سورۂ نساء کی آیت ۷۷ میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ براہِ راست جنگی اقدام کے بجائے، رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے آپ نے دیگر تدابیر اختیار کیں۔ اللہ کے اِذن سے جو اقدام کارگر ثابت ہوا، وہ مدینہ کی جانب ہجرت کا اقدام تھا۔

ہجرت کے بعد

مدینہ پہنچ جانے کے بعد آپ کو جنگی اقدام کی اجازت اللہ نے دی۔ جنگِ بدر سے جنگِ احزاب تک غزوات کا ایک دور مکمل ہو جاتا ہے۔ جنگِ احزاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس موقع پر اسلام کے دشمن یکجا ہو کر مدینے پر چڑھ آئے تھے۔ اللہ کے فضل کی بنا پر پچیس دن کے محاصرے کے باوجود، وہ دشمنانِ حق، مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ بالآخر قدرتِ خداوندی سے شدید آندھی آئی اور راتوں رات حملہ آور لشکر، اس آندھی کی تاب نہ لا کر میدانِ جنگ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس موقع پر ارشاد فرمایا کہ ''اَب قریش تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے، اب تم اُن پر چڑھائی کرو گے۔'' آپ کا یہ ارشاد اِس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب حق و باطل کی کشمکش، ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ جس میں اقدام، حق پرستوں کی طرف سے ہوگا اور باطل کو اپنی مدافعت کرنی پڑے گی۔

اس نئے مرحلے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اشارہ ملنے کے بعد، ہجرت کے پانچ سال بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عمرے کا ارادہ فرمایا۔ حج اور عمرہ اُن اچھی روایات کا جز تھے، جو دینِ ابراہیمی کے باقیات کے طور پر عرب میں موجود تھیں۔ قریش، عرب کے مسلمہ رواج کے مطابق، آپ کو عمرہ کرنے سے روکنے کا کوئی جواز نہ رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے صریح دھاندلی سے کام لیا اور آپ کو عمرہ نہ کرنے دیا۔ تاہم عمرہ کرنے کے لیے آپ کے اقدام نے اہم نتائج پیدا کیے۔ ایک جانب قریش کی اخلاقی پوزیشن مجروح ہوئی اس لیے کہ وہ عرب کے مسلمہ رواج کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔ دوسری جانب، مسلمانوں نے اپنے عمل سے یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کا حق رکھتے ہیں اور جو لوگ یہ حق انھیں نہیں دینا چاہتے، وہ مسلمانوں پر اپنی اس زیادتی کو درست ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ سب سے اہم نتیجہ صلحِ حدیبیہ کی شکل میں سامنے آیا۔ اس صلح کی بعض ناگوار شرائط کے باوجود، اہم نتیجہ یہ نکلا کہ دعوت کی وسیع راہیں کھل گئیں۔ جنگوں کی وجہ سے مکہ اور مدینہ کے باشندوں کا رابطہ بہت محدود ہو گیا تھا۔ جنگ بندی

ہوجانے سے رابطے کے وسیع مواقع پیدا ہوگئے اور دعوتِ اسلامی کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ تمام تدابیر کا اصل مدعا بہرحال یہی تھا کہ دعوتِ حق کے راستے کی رکاوٹیں دور کی جائیں۔ تاریخی واقعات کی ترتیب پر نظر رکھی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ فتحِ مکہ، صلحِ حدیبیہ کا لازمی نتیجہ تھی۔ قریش نے یہ صلح کرکے، حق کی فتح کے دروازے خود کھول دیے تھے اور اب تاریخ کا دھارا جس رخ کو اختیار کر چکا تھا، اس سے پھیرا نہ جاسکتا تھا۔

فتحِ مکہ کے بعد، دعوتِ حق کا بین الاقوامی دور شروع ہوتا ہے۔ اسلامی دعوت کے مزاج کے مطابق، اس بین الاقوامی خطاب کے مرحلے میں بھی 'دعوت و جہاد' کی یکجائی نظر آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکمرانوں کو خطوط لکھ کر اُن کو اللہ کی بندگی اختیار کرنے کی دعوت دی اور اپنی قوموں کے انجام کا ذمہ دار بھی اُن کو ٹھہرایا۔ شاہِ روم نے دعوتِ حق کے جواب میں متکبرانہ طرزِ عمل اختیار کیا چنانچہ آپ نے غزوہ تبوک کی شکل میں سلطنت روم کے خلاف اقدام فرمایا۔ گو عملاً جنگ نہیں ہوئی اس لیے کہ قیصرِ روم مقابلے کے لیے نہ آیا تاہم یہ حقیقت ثابت ہوگئی کہ اسلام ایک ابھرتی ہوئی طاقت ہے، جس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے عرب کے اور دنیا کے عوام و خواص اسلام کے پیغام کو سنجیدہ غور کا مستحق سمجھنے لگے اور فضا قبولِ حق کے لیے سازگار ہوئی۔

اسوۂ نبوی پر اس سرسری نظر سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ دعوت اور جہاد، دونوں کا مقصد ایک ہے یعنی اظہارِ دین۔ دعوت سے راہِ حق واضح ہوتی ہے اور جہاد سے قبولِ حق کی آزادی محفوظ رہتی ہے۔

اے رہروِ فرزانہ، رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو

☆☆☆

اقامت دین، دعوت اور جہاد

امتِ مسلمہ پر یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ ایک صدی سے دنیا کے بہت سے ملکوں میں اسلامی جماعتیں اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ اپنے احوال کے مطابق وہ اللہ کے دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان میں وہ تنظیمیں اور جماعتیں قابلِ ذکر ہیں جن کا دین کا تصور نسبتاً جامع ہے۔ یعنی وہ تصور جس میں دین کے سارے پہلوؤں پر توجہ دی گئی ہے۔ ایسی جماعتوں کو 'اسلامی تحریک' کہا جاتا ہے۔ ان کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ان سب کوششوں کی ابتدا جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون سے ہوئی ہے۔ اکثر تنظیمیں اس لٹریچر سے استفادہ کرتی ہیں، جو جماعت کے بزرگوں اور اخوان المسلمون کے رہنماؤں نے تیار کیا تھا۔

تازہ منظر یہ ہے کہ پچھلی ربع صدی میں پوری دنیا میں اسلام اور کفر کی کشمکش تیز ہو چکی ہے اور دن بدن تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اس کشمکش میں اسلام کے داعیوں کے سامنے جو دشواریاں ہیں اس میں مسلمانوں کی بے عملی ایک بڑی دشواری ہے۔ مسلمانوں میں بعض غلط رویے موجود ہیں فکری و عملی، کچھ پرانے کچھ نئے، وہ فروغِ دعوت کے راستے میں حائل ہیں۔ ان سب دشواریوں پر دین کے خادموں کو قابو پانا ہے۔ مسلمانوں کے رویوں کی اصلاح بھی کرنی ہے اور ان کو صالح عمل پر بھی ابھارنا ہے۔ آج دنیا کی عمومی صورتِ حال یہ ہے کہ اسلامی تحریک نے جو پیغام پیش کیا ہے وہ ان عناصر کو ناگوار ہے جو اللہ سے بغاوت پر آمادہ ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ پوری دنیا پر اللہ کے باغیوں کی مرضی چلے۔

اسلامی دعوت کی علم بردار تنظیمیں جب قائم ہوئیں اس وقت بھی ان کی دعوت ہر

گوشے میں پسند نہیں کی جاتی تھی بلکہ بعض حلقوں میں ناگواری کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اب اس مخالفت کی شدت بڑھ گئی ہے، اسلامی اصطلاحات میں اس وقت خاص طور پر تین اصطلاحات مخالفت کا نشانہ ہیں۔ اقامت دین، اسلامی ریاست اور جہاد۔ ان تین اصطلاحات کی معنویت کی نفی کرنے والوں میں دانا دشمن بھی شامل ہیں اور نادان دوست بھی۔ پچھلے دنوں جہاد کے موضوع پر بعض کتابیں سامنے آئی ہیں، جن میں بہت سی صحیح باتوں کے ساتھ جہاد کے سلسلے میں غلط باتیں بھی کہی گئی ہیں۔ البتہ اسلوبِ نگارش عالمانہ اور سنجیدہ ہے۔ اسی طرح کچھ اور تحریروں میں اقامتِ دین اور اسلامی ریاست کی مقصودیت کی نفی کی جارہی ہے۔

اسلامی اصطلاحیں

یہ واقعہ ہے کہ مختلف احوال میں اسلامی تنظیموں نے اپنے پیغام اور دعوت کا تعارف کرانے کے لیے مناسب اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اسلام کی ترجمانی کے لیے کون سی اصطلاح داعی استعمال کرے اس کے لیے داعی کو حکمت سے کام لینا ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث سے ہی اصطلاحیں ماخوذ ہوں، یہ بات بہرحال لازم ہے۔ چنانچہ قرآن کے طالب علم جانتے ہیں کہ اقامت دین، اظہارِ دین، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، شہادت علی الناس، اعلاء کلمۃ اللہ، دعوت دین، یہ سب کلیدی دینی اصطلاحیں ہیں۔ ان اصطلاحوں میں سے داعی کس کو تخاطب کے دوران استعمال کرے، اس سلسلے میں دین نے اسے پابند نہیں کیا ہے۔ قرآن وحدیث کے دائرے میں، حالات اور سننے والوں کی رعایت کرتے ہوئے تمام موزوں اصطلاحیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ دعوت کی مصلحت کا یہ تقاضا بہرحال ہے کہ اصطلاحیں ایسی منتخب کی جائیں جو زیادہ سے زیادہ جامع ہوں۔ مطلوب یہ ہے کہ دین کے تعارف کے ذیل میں، دینی ہدایات وتعلیمات کے حقیقی معانی لوگوں کے سامنے آجائیں۔ اس لحاظ سے جب غور کرتے ہیں تو مذکورہ بالا اصطلاحوں میں ''اقامتِ دین''، سب سے زیادہ جامع اصطلاح معلوم ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی اپنے

نصب العین کے تذکرے لیے اقامتِ دین ہی کی اصطلاح استعمال کرتی ہے۔ بہت سی اسلامی تنظیمیں دوسرے الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ یہ ذمہ داری جماعت اسلامی کے وابستگان کی ہے کہ اس جامع اصطلاح کو زندہ رکھیں، اُسے متروک نہ ہونے دیں، جسے بڑی کاوش سے متعارف کیا گیا ہے۔ دیگر مخلص عناصر کی بھی ذمہ داری ہے کہ دین کی اقامت کا جذبہ اُمت کے اندر پیدا کریں۔

جماعت اسلامی کا دستور

جماعت اسلامی ہند اپنی عددی طاقت کے لحاظ سے تو زیادہ قوی نہیں، لیکن اپنی فکر کے لحاظ سے وہ کمزور نہیں ہے۔ اللہ کے فضل سے وہ دینی فکر کی حامل ہے جو مضبوط فکر ہے۔ اہلِ حق جس فکر پر قائم ہوں اس پر انہیں قائم رہنا چاہیے۔ قرآن وسنت سے کوئی ثابت کرے کہ داعی گروہ کے پیغام میں کوئی خامی ہے، تو اصلاح کر لینی چاہیے۔ لیکن محض نادان لوگوں کے شور شرابے اور مخالفت نیز پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ حالات سخت ہوں تو اُن سے متاثر ہونے کے رجحانات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ایسے رجحانات سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ اوپر سے نیچے، نوجوانوں سے بوڑھوں تک ہر مومن کے قلب میں باطل کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ دین کے خادموں اور حق کے داعیوں کو صحیح اسلامی فکر پر ہر حال میں قائم رہنا چاہیے۔ اس فکر کی پیش کش میں موزوں اصطلاحوں کی بڑی اہمیت ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ اسلام کی ترجمانی کے لیے دینی اصطلاحوں کے ذکر میں داعی کو جھجکنا نہیں چاہیے۔ جہاد اہم دینی اصطلاح ہے، دیگر اصطلاحوں کی طرح بات چیت میں جہاں ضرورت ہو، اس کا ذکر کرنا چاہیے۔ اسی طرح اقامتِ دین ایک بنیادی اصطلاح ہے، اسلامی نصب العین کی وضاحت کے لیے بوقت ضرورت اس کا استعمال کرنا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ اقامت دین کی تشریح میں اسلامی ریاست کے ذکر کو حذف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اسلامی ریاست کا تعارف بھی، اسلام کے پیغام کا حصہ ہے۔ جماعتِ اسلامی ہند کے دستور میں اقامتِ دین کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کچھ بنیادی باتیں درج کی گئی ہیں۔

جماعت کے دستور کے ابتدائی حصے میں اسلامی عقیدے کی تشریح کے بعد نصب العین درج کیا گیا ہے۔ نصب العین کے معنی ہیں وہ فرض جو ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے۔ جو کام اہلِ ایمان کو کارگاہِ حیات میں عملاً کرنا ہے وہ نصب العین کے تحت آتا ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے دستور میں لکھا گیا ہے کہ جماعت کا نصب العین، اقامتِ دین ہے، جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے۔ حقیقی محرک، دیگر صالح محرکات کی نفی نہیں کرتا بلکہ وہ سب حقیقی محرک کے اندر شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً انسانیت کی فلاح کی تمنا، انسانوں سے محبت، انسانی مسائل کے حل کی جستجو۔ بہر حال حقیقی محرک کی جامع تعبیر اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی فلاح حاصل کرنا ہے۔

اقامتِ دین کے سلسلے میں ذہن میں پہلا سوال یہ آتا ہے کہ لفظ دین کے معنی کیا ہیں؟ دین کے معنی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی کتاب 'قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں' میں بیان کیے ہیں۔ کتاب میں زیرِ بحث چار بنیادی اصطلاحیں ہیں: رب، الٰہ، عبادت اور دین۔

دین

دین ایک کلیدی اصطلاح ہے۔ سید مودودیؒ کی مذکورہ تحقیقی تصنیف میں دین کے چار معانی بیان کیے گئے ہیں، ان میں جو معنی، اقامتِ دین کی اصطلاح سے مناسبت رکھتا ہے، وہ ہے: ''زندگی گزارنے کا طریقہ۔'' یہ مفہوم مسلمانوں کے درمیان معروف ہے۔ عموماً کوئی شخص دین کا لفظ استعمال کرتا ہے، تو اس سے یہی معنیٰ مراد لیتا ہے۔ اس مفہوم پر دلالت کرنے والی قرآن مجید کی متعدد آیات موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ زندگی گزارنے کے راستہ کی تفصیل اللہ کی شریعت بتاتی ہے۔ دین کا مفہوم جان لینے کے بعد دوسرا اہم سوال سامنے آتا ہے، جو خود انسانی زندگی سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً انسانی شخصیت سے متعلق ایک موضوع ایمان ہے۔ انسان کے لیے موزوں عمل کی نشان دہی بھی ایک اہم موضوع ہے۔ انسانی تعلقات، نظامِ حکومت، لین دین کے طریقے، یہ سب زندگی کے اہم امور ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا

دین میں یہ سب باتیں شامل ہیں یا محض بعض امور، دین کا دائرہ ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے۔قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زندگی کے سارے پہلو شامل ہیں۔ یہ بات مسلمانوں میں تسلیم شدہ ہے۔

اس جامع دین کے بارے میں قرآنِ مجید ہدایت دیتا ہے کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ یعنی دین کو قائم کرو۔ سوال یہ ہے کہ اس جملے میں دین سے کون سا دین مراد ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ آیتِ مذکورہ میں یہ بات واضح ہے۔ دستورِ جماعت اسلامی میں وضاحت کی گئی ہے کہ 'الدین' سے مراد اسلام ہے، اس لیے کہ اللہ کے نزدیک کوئی اور دین قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس پر قرآن مجید کے دلائل سے ہر صاحب علم واقف ہے۔ دستور جماعت اسلامی میں نصب العین کے لیے حقیقی محرک، رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کے حصول کو قرار دیا گیا ہے۔ ضمنی محرک یہ ہے کہ انسانی مسائل حل ہوں، انسانوں کی مشکلات دور ہوں اور انسان کی زندگی کی صالح تعمیر ہو۔ یہ سب محرکات رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت سے ہم آہنگ ہیں۔ان کو حقیقی محرک میں شامل سمجھا جائے گا۔

اقامتِ دین کا مفہوم

ترتیب کے لحاظ سے اگلا اہم سوال یہ ہے کہ دین کی اقامت کا مطلب کیا ہے۔اس سوال کے جواب کے لیے اقامتِ دین کو اقامتِ صلوٰۃ پر قیاس کر سکتے ہیں۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کی تلقین، کتابِ الٰہی میں بار بار آئی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا جو مفہوم امت سمجھتی ہے، وہ یہ ہے کہ اقامت سے محض نماز کی ادائیگی مراد نہیں ہے۔ بلکہ اہتمام کے ساتھ اس کی ادائیگی مراد ہے۔مثلاً اہتمام میں یہ بات شامل ہے کہ نماز باجماعت ادا کی جائے، مساجد کا نظم قائم ہو، جب نماز ادا ہو تو شرائط و آداب کے ساتھ ہو، اس کے اثرات پوری زندگی پر مرتب ہوں، جو لوگ نماز ادا نہ کر رہے ہوں ان کو توجہ دلائی جائے اور پورے معاشرے میں نماز کو رواج دیا جائے۔ یہ سب امور اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہیں۔ محض سادہ لفظوں میں نماز ادا کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اقامتِ صلوٰۃ کی ہدایت دی گئی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ

پر قیاس کرتے ہوئے اقامتِ دین کے معنی متعین کیے جاسکتے ہیں، گویا ہدایت صرف اتنی نہیں دی گئی کہ دین پر عمل کرو، بلکہ رب کائنات یہ کہتا ہے کہ دین کو قائم کرو یعنی دین پر عمل کرو پورے اہتمام کے ساتھ۔ دستور جماعت میں درج تشریح میں یہی بات کہی گئی ہے۔ اقامتِ دین سے مراد یہ ہے کہ اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اقامتِ دین، دین پر عمل کا نام ہے۔ البتہ مطلوب یہ ہے کہ دین پر عمل اہتمام کے ساتھ ہو۔ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر، پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے۔ ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے۔ رہ نمائی کے لیے کسی اور دین کی طرف نہ دیکھا جائے۔ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام گوشوں میں اللہ کے دین کو اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔

فرد، سماج اور ریاست، تینوں سے دین خطاب کرتا ہے۔ اقامتِ دین کی اس تشریح کا جو جز، کوتاہ بینوں کو سب سے زیادہ ناگوار ہے، وہ ریاست کی تشکیل ہے۔ اُن کی ناپسندیدگی کے باوجود — واقعہ یہ ہے کہ درج بالا تشریح، اقامتِ دین کی درست تشریح ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حکومت و ریاست زندگی کا جز ہے۔ جب دین پوری زندگی سے بحث کرتا ہے تو ریاست کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے، چنانچہ اقامتِ دین میں اسلامی ریاست کی تشکیل یقیناً شامل ہے۔ دستورِ جماعت میں مزید وضاحت کے لیے کہا گیا ہے کہ دین قائم کرنے کا مثالی نمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین کا ہے۔ ظاہر ہے کہ امت میں اس امر پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دورِ نبوی اور دورِ خلافتِ راشدہ مثالی دور تھا، جو مسلمانوں کے لیے معیار اور کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپنی کتاب 'خلافت و ملوکیت' میں مولانا مودودیؒ نے خلافتِ راشدہ کی سات خصوصیات گنائی ہیں۔ یعنی انتخابی خلافت، شورویٰ طرزِ حکومت، بیت المال کا امانت ہونا، حکومت کی جواب دہی، قانون کی بالاتری، عصبیتوں سے پاک طرزِ حکم رانی اور روحِ جمہوریت کی موجودگی۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ خلافت اور بادشاہی میں کوئی خاص امتیاز نہ تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ نے بتایا ہے کہ وہ سات بنیادی اصول، جو اسلام کی اصل

دَین ہیں، خلافتِ راشدہ میں موجود تھے، مگر بادشاہی میں وہ ضابطے قائم نہیں رہے۔ خلافت راشدہ کا دور مثالی دور تھا۔ پوری امت کے نزدیک وہ مثالی دور ہے۔ اسی نمونے کو دین کے خادموں کے پیش نظر ہونا چاہیے۔ اقامت دین کی یہ وہ تشریح ہے جو داعیانِ حق کو سمجھنی بھی ہے اور یاد بھی رکھنی ہے۔

اسلامی ریاست

اسلامی ریاست کی مقصودیت پر بعض اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ ''حکومت تو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ اس کے لیے ارادی وشعوری کوشش کرنا اہلِ ایمان پر فرض نہیں۔ حکومت وہ انعام ہے جو ایمان اور عمل صالح کے نتیجے میں اللہ کی جانب سے مومنین کو ملا کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی تنظیموں کے کارکنان جب کہتے ہیں کہ دین قائم کرنے کی کوشش کرو، (جس میں یہ بات شامل ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کرو) تو اُن کی یہ دعوت، اسلامی مزاج کی ترجمانی نہیں کرتی۔ دین کا ہم سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ حکومت کے قیام کے لیے سعی کریں۔'' اس اعتراض میں اتنی بات تو صحیح ہے کہ حکومت یقیناً اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

> وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○
>
> (النور: ۵۵)

''تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ انھیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا، جو ان سے پہلے گزرے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ان کے لیے ان کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے وہ ان کے لیے پسند کر چکا ہے۔ وہ ان کی (موجودہ)

حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔ بس وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ
کسی کو شریک نہ کریں۔ اس کے بعد بھی جو لوگ ناشکری کریں وہ فاسق ہیں۔"

مذکورہ بالا آیت کے مطابق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کے بدلے میں اہلِ ایمان سے یہ وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین میں اقتدار بخشے گا۔ لیکن قرآن مجید میں محض یہی ایک آیت نہیں ہے، جو اس موضوع کا ذکر کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت کے سلسلے میں ایک پہلو انعام کا ہے جس کا اس آیت میں تذکرہ ہوا۔ دوسرا پہلو، دین کے غلبے کے لیے اس سعی و کوشش کا ہے جس کا مطالبہ اہلِ ایمان سے قرآن کرتا ہے۔ اس دوسرے پہلو کا تذکرہ مثال کے طور پر سورۂ صف میں ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَّ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الصف: ۱۰-۱۳)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذابِ الیم سے بچا دے۔ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور اللہ وہ دوسری چیز بھی تمہیں دے گا جو تم چاہتے ہو۔ یعنی اللہ کی نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبیؐ! اہلِ ایمان کو اس کی بشارت دے دو۔"

ان آیات سے فوراً پہلے اس سورت میں منصوبہ الٰہی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کو

غالب کرے گا، چاہے یہ امر مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔ پھر مسلمانوں کو نفع بخش تجارت کی ترغیب دی گئی ہے۔ تجارت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے سادہ معنوں میں ایمان اور عمل کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں سے کہا یہ گیا ہے کہ ایمان لاؤ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ جہاد یقیناً عمل صالح کا جز ہے، لیکن اس کی اہمیت کی بنا پر صراحت کے ساتھ اس کا ذکر ہے۔ پھر بتایا گیا کہ جہاد کا صلہ کیا ہوگا؟ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں معاف کردے گا، بہترین جنت میں تمہیں جگہ دے گا اور اس دنیا میں وہ دوسری چیز بھی دے گا جو تم چاہتے ہو۔ وہ حق کی فتح ہے جو جلد حاصل ہوجائے گی۔

منشائے الٰہی کی وضاحت کے لیے سورۂ صف کی ترتیب پر بھی غور کرنا چاہیے۔ سورت شروع اس تنبیہ سے ہوتی ہے کہ بعض لوگ بڑے بڑے دعوے کرتے تھے کہ ہم اللہ کے راستے میں جہاد کرنا چاہتے ہیں، ان سے کہا گیا کہ وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ پھر تاریخی مثالوں کے ذکر کے بعد بتایا گیا کہ اللہ اپنے دین کو غالب کرے گا، اُس نے رسول کو بھیجا ہی اس مقصد کے لیے ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ سورۂ صف میں اظہارِ دین کی نسبت، اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ یہ بات صحیح ہے۔ لیکن اللہ خود اہلِ ایمان کو بلا رہا ہے کہ اظہارِ دین کے لیے کی جانے والی سعی میں حصہ لو۔ اہلِ ایمان کے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ اُن کو اس عظیم کام میں شرکت کا موقع ملے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسی لیے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے اللہ کی طرف میرا مددگار؟ اس مثال کے تذکرے کے ساتھ، اللہ نے مومنوں سے کہا ہے کہ كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ۔ (اللہ کے مددگار بنو)۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اظہارِ دین کے کارِ عظیم میں شرکت، انسانوں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ہے۔ اللہ اُن کو موقع دے رہا ہے کہ تم اس کام میں حصہ لو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایمان لاؤ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اس خدمت کے نتیجے میں اجر کے طور پر جنت ملے گی اور دنیا میں بھی فتح حاصل ہوگی۔ عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں کی مثال دے کر بتایا گیا ہے کہ بالآخر وہ اپنے مخالفین پر غالب رہے۔ بلاشبہ اہلِ ایمان سے

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ فتح کے لیے کوشش کرو، قرآن کا اسلوب یہ نہیں ہے بلکہ اہلِ ایمان کو وہ کام بتایا گیا جو انہیں کرنا ہے۔ یہی اسلوب مناسب ہے کہ اہلِ ایمان کو یاددہانی کی جائے کہ دین کی پیروی کرو جس میں جہاد شامل ہے۔ پھر توقع رکھو کہ اللہ فتح عطا فرمائے گا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سورۂ صف کی مذکورہ بالا آیات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرنا تو اللہ کا کام ہے، لیکن تمہارا فرض یہ ہے کہ ایمان پر پوری طرح مستقیم رہ کر اُس کے راستے میں جان و مال سے جہاد کرو۔''

یہ بات درست ہے کہ حق کی فتح اللہ کا انعام ہے لیکن اس انعام کو حاصل کرنے کے لیے اہلِ ایمان کو بھی کچھ کرنا ہے۔ جو کرنا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے بتادیا ہے۔ حق کی فتح کا مظہر یہ ہے کہ لوگ اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوں۔ یعنی اللہ کے دین میں داخل ہونے کے راستے میں حائل رکاوٹیں ختم ہوجائیں۔

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ○ (النصر)

> ''جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہوجائے اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا موقف

مولانا تھانویؒ برصغیر کے معروف عالم گزرے ہیں جن کے علمی مقام و مرتبے کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ انھوں نے جہاد کے سلسلے میں فرمایا:

> ''جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے، اُسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ نماز روزہ کامیابی کے لیے کافی ہے۔ بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوتی اور نہ ہوسکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے

اور وہ چیز قتال و جہاد ہے۔

غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز اور روزہ تو غلبے کی شرط ہے، اگر نماز، روزہ اور اطاعت ہوگی تو غلبہ ہوگا اور جہاد، غلبے کی علت ہے۔ گو نماز، روزہ فرضِ عین ہے اور جہاد فرضِ کفایہ ہے مگر غلبے کی علت جہاد ہی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ، دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے۔ اور یہ میری رائے، آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال و جہاد نہ ہوگا، اُس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہوسکتی۔''

(بہ حوالہ اسلامی حکومت و دستورِ مملکت، مرتب محمد زید مظاہری ندوی)

مولانا تھانویؒ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

''میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ، حکومت عادلہ مسلمہ قائم فرمادے اور میں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ میں نے عادلہ (یعنی شریعت کے مطابق انصاف کرنے والی حکومت) کی قید اس واسطے لگائی کہ سلطنت مسلمہ تو بحمدہ تعالیٰ آج کل بھی متعدد جگہ ہیں مگر عادلہ نہیں۔ بلکہ سب کی حالت بے راہ روی کی ہے۔ امورِ شرعیہ کی پابند نہیں۔'' (ایضاً)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ راوی ہیں کہ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بات (مولانا تھانویؒ کی خدمت میں) حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی کہ ''جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطے پر خالص اسلامی حکومت ہو، سارے قوانین وتعزیرات وغیرہ کا اجراء احکامِ شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظامِ زکوٰۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں وغیرہ۔ اس مقصد کے لیے صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیے۔'' (ایضاً)

اقامت دین

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے دین کے نظامِ حیات ہونے کا تصور پیش کیا۔

نصف صدی قبل ایک صاحبِ علم نے اس تصور پر تنقید کی۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ مولانا مودودیؒ نے تصورِ دین کے سلسلے میں جو باتیں پیش کی ہیں سب صحیح بیان کی ہیں، کوئی بات غلط نہیں ہے۔ لیکن دین کا جو مجموعی نظام وہ پیش کرتے ہیں وہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ اس مجموعی خاکے میں انھوں نے اسلامی حکومت کو بنیادی اہمیت دے دی ہے۔ جب کہ دین میں اسلامی حکومت کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں۔ بلکہ صاحبِ ایمان کے اللہ سے تعلق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اس تنقید سے ملتا جلتا ایک سوال مولانا مودودیؒ سے پوچھا گیا تھا۔ کتاب 'رسائل و مسائل' میں اس کا جواب درج ہے۔ بہت سے سوالات کیے گئے تھے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا: ''نماز و روزہ، زکوٰۃ و حج اور جہاد، ان عبادات میں شرعاً مقصود بالذات کون سی عبادت ہے اور اولیٰ درجہ کس کو حاصل ہے؟ کیا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اسلام میں مقصود نہیں بلکہ ان کی حیثیت ذرائع اور وسائل کی ہے۔ مقصود دراصل جہاد ہے؟ یہ عقیدہ، آپ کا ہے یا نہیں؟''

مولانا مودودیؒ نے اس سوال کا یہ جواب دیا:

> ''میرے نزدیک مقصود دراصل اقامتِ دین ہے۔ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلاَ تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ۔ (دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ)۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اس دین کے ارکان ہیں جن پر دین قائم ہوتا ہے۔ اس لیے اُن کو قائم کرنا، اقامتِ دین کے لیے مطلوب ہے۔ اور جہاد چونکہ دین کو اس کے پورے نظام کے ساتھ قائم کرنے کا ذریعہ ہے، اس لیے وہ بھی اقامتِ دین ہی کے لیے مطلوب ہے۔...... نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں وہ چیزیں نہ بتاؤں جو دین کا سر اور ستون اور کوہان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دیکھو، دین کا سر، اسلام ہے، اُس کا ستون نماز ہے اور جو چیز کوہان کی حیثیت رکھتی ہے، وہ جہاد ہے۔'' (رسائل و مسائل، حصہ چہارم)

سید مودودیؒ کے پیش کردہ تصورِ دین پر اعتراض، مولانا مودودیؒ کی بات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے یہ نہیں کہا کہ دین کا مرکزی نکتہ اسلامی حکومت ہے، مولانا

مودودیؒ نے تو یہ بات پیش کی ہے کہ مرکزی نکتہ، دین کی اقامت ہے۔ اگر مسلمان یہ بھول جائیں کہ انہیں پورے دین کو قائم کرنا ہے تو گویا انھوں نے دین کو سمجھا ہی نہیں۔ یہ مولانا مودودیؒ کی بنیادی فکر ہے۔ سید مودودیؒ کے تصورِ دین پر تنقید کے باوجود جہاں تک جماعت اسلامی پاکستان اور جماعت اسلامی ہند کے عملی پروگرام کا تعلق ہے، مذکورہ صاحبِ علم نے اس پروگرام سے اتفاق کیا ہے۔ اُن کو اختلاف صرف تعبیر سے ہے جو دین کی مجموعی تفہیم کے ذیل میں پیش کی گئی ہے۔ اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تصور تو درست نہ ہو مگر عملی پروگرام درست ہو۔ یہ بات ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے جس طرح دین کو سمجھا اور پیش کیا ہے، وہ اسی فہم کے مطابق ہے، جو امت کے اندر رائج اور معروف ہے۔ جماعت اسلامی نے دین کی کوئی ایسی تشریح نہیں کی ہے جو امت کی روایت سے مختلف ہو۔

نفاذِ دین کا طریقہ

حالیہ دنوں میں ایک اور صاحبِ علم کے اعتراضات سامنے آئے ہیں۔ اعتراضات کے بیان میں پاکستان کا پس منظر جھلکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی مسلم ملک کے عوام منظور کریں تو وہاں اسلامی ریاست قائم ہو سکے گی، اگر عوام نہ منظور کریں تو کسی کو حق نہیں کہ ان پر اسلامی ریاست کا نظام نافذ کرے۔

اس اعتراض کے دو پہلو ہیں: ایک عملی ہے اور دوسرا فکری۔ عمل کے اعتبار سے جہاں تک اسلامی تنظیموں کے طریقِ کار کا معاملہ ہے وہ تنظیمیں، مسلمان معاشرے کی اصلاح و تربیت کو بنیادی اہمیت دیتی ہیں۔ وہ رائے عامہ کی تربیت کر کے ہی اسلامی ریاست کی جانب پیش قدمی کرنا چاہتی ہیں۔ مولانا مودودیؒ فوجی انقلاب کے قائل نہ تھے۔ اس لیے عملی دنیا میں، اسلامی تحریکوں کے طریقے پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

سید مودودیؒ کہتے ہیں:

''اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے

اور اسلحہ کے ذریعے سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے۔ اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی دعوت ہی کے ذریعے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلائیے۔ بڑے پیمانے پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے۔ اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے۔ اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا، وہ ایسا پائیدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کرسکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا، اُسی راستے سے وہ مٹایا بھی جاسکے گا۔'' (تفہیمات، حصہ سوم)

جہاں تک مذکورہ بالا اعتراض کے فکری پہلو کا تعلق ہے، وہ صراحتاً غلط ہے۔ جب ایک شخص نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا تو وہ پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت کا پابند ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری زندگی کے ہر پہلو میں تو اللہ کے دین پر عمل ہوگا البتہ میری مرضی سے قائم ہونے والی ریاست، اللہ کے دین سے آزاد ہوگی۔ دین سے بے نیازی کی بات جس طرح ایک ایمان لانے والا فرد نہیں کہہ سکتا اسی طرح اسلامی معاشرہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کسی ملک کے مسلم عوام دین سے لاتعلقی کے اظہار کا حق نہیں رکھتے۔ جب تک وہ کلمہ پڑھتے ہیں، وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری سماجی زندگی اور نظامِ خاندان میں تو شریعت کی حکم رانی ہوگی، بازار اور لین دین میں بھی شریعت نافذ ہوگی مگر کارِ حکومت میں نہ ہوگی، جب تک ہم اس کی منظوری نہ دیں۔ یہ بالکل غلط موقف ہوگا۔

مذکورہ اعتراض کے ذیل میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''اگر کسی مسلم ملک میں شریعت نافذ کرنی ہے تو اُس کے ایک ایک حکم کو عوام سے منظور کرانا چاہیے۔ مثلاً عوام کے سامنے یہ تجویز رکھی جائے کہ سود بند کیا جائے، اگر عوام منظور کرلیں تو سود بند ہوجائے گا، نہ منظور کریں تو بند نہیں ہوگا۔'' کوئی صاحبِ ایمان، مسلم عوام کا یہ حق تسلیم نہیں کرسکتا۔ حکمت کا تقاضا

یہ تو یقیناً ہے کہ مسلم عوام کی تربیت کی جائے تا کہ دین حق کی قدر و قیمت سے وہ آگاہ ہوں، اس کو بوجھ نہ سمجھیں۔ لیکن یہ بات کہ شریعت کا نفاذ ان کی منظوری پر منحصر ہے، غلط خیال ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا وہ سب کو معلوم ہے۔

اگر صالح عناصر کو اقتدار حاصل ہو تو نفاذِ قانونِ الٰہی، اُن کی ذمہ داری ہے۔ یہ بات کہ وہ عوام کی مرضی کے منتظر رہیں، یہ درست موقف نہیں ہے۔ دین کے موقف کے مطابق جو صحیح طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ اقتدار حاصل ہو تو بتدریج، شریعت نافذ کی جائے اور عوام کی تربیت کی کوشش بھی ہو۔ بہر حال شریعت کا نفاذ لوگوں کی مرضی پر موقوف نہیں ہے۔

مصلحانہ جہاد

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دنیا سے ظلم اور جبر کو مٹانے کے لیے کوشش تو درست ہے اور اس میں طاقت صَرف کرنی چاہیے، یہ دین کا تقاضا ہے۔ لیکن کفر کے غلبے کو ختم کرنے کے لیے، کسی کوشش اور جہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ اس اعتراض کی تائید میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ آزادی دی ہے کہ وہ چاہے تو ایمان لائے اور چاہے تو کفر کرے۔ اس آزادی کا مدعا یہ ہے کہ افراد کی طرح انسانی گروہوں کو بھی یہ آزادی حاصل ہو کہ وہ چاہیں تو اپنے زیرِ تسلط علاقوں میں کفر کی حکومت قائم کریں۔

اپنی تحریروں میں مولانا مودودیؒ نے اس غلط فہمی کو دور کیا ہے۔ فرد کو یہ آزادی یقیناً حاصل ہے کہ وہ دین حق کو قبول کرے یا نہ کرے۔ اسلامی حکومت میں بھی یہ آزادی حاصل ہے کہ ایک شخص چاہے تو مسلمان ہو جائے اور چاہے تو کفر پر قائم رہے۔ لیکن اللہ کی زمین پر کسی کا بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مرضی کے بجائے اپنی مرضی، انسانوں پر چلائے۔ باطل کے غلبے کا خاتمہ بھی یقیناً جہاد کا مقصد ہے۔ مصلحانہ جہاد کا انکار کرنے والے معترضین بسا اوقات مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کا حوالہ بھی دیتے ہیں لیکن یہ دونوں اساطینِ علم مصلحانہ جہاد کی نفی نہیں کرتے۔ ان کی تفسیریں اور تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مصلحانہ جہاد پر اعتراض کرنے والوں نے اس کی ضرورت پر غور نہیں کیا، اس لیے ایک غلط موقف اختیار کرلیا ہے۔ قرآن مجید انسانوں کو پیغام دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو باطل اور کفر سے آزاد کرائیں۔ انسانوں کے درمیان اس پیغام کی اشاعت، دعوت سے ہوگی۔ فکرِ صالح کی ترویج کا کام انسانوں سے بات چیت کے ذریعے کیا جائے گا۔ اُن کو سمجھانے بجھانے کی سعی کی جائے گی۔ لیکن جب دعوت کا راستہ روکا جائے تو رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے بشرطِ استطاعت، طاقت کا استعمال درست ہوگا۔ طاقت کا یہ استعمال بھی شرائط کی تکمیل کے بعد ہوگا اور حدود وآداب کے تحت ہوگا۔ من مانے طریقوں سے نہیں ہوگا۔ بہر حال انسانی آزادی کی بحالی کے لیے (شرائط، حدود، آداب اور معاہدوں کی رعایت کے ساتھ) طاقت کے حکیمانہ استعمال کی، اہلِ ایمان کو اجازت ہوگی۔ براہِ راست اس سوال پر بحث کرنے کے بجائے کہ مصلحانہ جہاد کیا جاسکتا ہے یا نہیں، پہلے اس پر بحث کرنی چاہیے کہ بیان کردہ مقصد، اہم ہے یا نہیں۔ انسانوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنا، ابلاغِ حق اور قبولِ حق کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنا اور انسانی آزادی کا تحفظ، یہ امور ضروری ہیں یا نہیں؟ اس پر غور کرنا چاہیے۔ حق کی ترسیل، اس پر عمل اور اُس کے قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے تو ظاہر ہے کہ مصلحانہ جہاد کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اگر رکاوٹ ڈالی جائے تو جہاد کی ضرورت، مسلّم ہے۔

اظہارِ دین

اس بحث کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں باطل کے غلبے کا خاتمہ، اظہارِ دین کا تقاضا ہے۔ قرآن مجید میں اظہارِ دین کا تذکرہ تین مقامات پر ہے:

هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبہ: ۳۳)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔''

یہی الفاظ سورۂ صف کی آیت ۹ کے بھی ہیں۔ سورۂ فتح میں بھی اظہارِ دین کا ذکر کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ (الفتح:۲۸)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کردے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔''

سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت کی تشریح کے ذیل میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''اسلام کا غلبہ، باقی ادیان پر معقولیت اور حجت و دلیل کے اعتبار سے، یہ تو ہر زمانہ میں بحمد للہ نمایاں طور پر حاصل رہا ہے۔ باقی حکومت و سلطنت کے اعتبار سے، وہ اس وقت حاصل ہوا ہے اور ہوگا، جب کہ مسلمان اصولِ اسلام کے پوری طرح پابند اور ایمان و تقویٰ کی راہوں میں مضبوط اور جہاد فی سبیل اللہ میں ثابت قدم تھے یا آئندہ ہوں گے۔''

سورۂ فتح کی درج بالا آیت کی تفسیر میں موصوف لکھتے ہیں:

''اصول و فروع اور عقائد و احکام کے اعتبار سے یہی دین سچا اور یہی راہ سیدھی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ اس دین کو اللہ نے ظاہر میں بھی سینکڑوں برس تک سب مذاہب پر غالب کیا اور مسلمانوں نے صدیوں تک ...... بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور آئندہ بھی دنیا کے خاتمے قریب، ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب ہر چہار طرف دینِ حق کی حکومت ہوگی۔ باقی حجت و دلیل کے اعتبار سے تو دین اسلام ہمیشہ ہی غالب رہا اور رہے گا۔''

سورۂ فتح کی مذکورہ بالا آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

''اتمام بہ معنی اثبات وتقویت بالدلائل، تو اسلام کے لیے ہر زمانے میں عام ہے اور یہی مقابل ہے اخفا یعنی رد کا۔ اور مع اعتبار انضمامِ سلطنت، مشروط ہے صلاحِ اہلِ دین کے ساتھ۔''

سورۂ صف کی آیت ۹ کی تشریح میں موصوف لکھتے ہیں:

''(دین کا غلبہ) باعتبار حجت و دلیل تو ہمیشہ (ہوگا) اور باعتبارِ شوکت و سلطنت اسلام کے (واقع ہوگا) بشرطِ صلاحِ اہلِ دین کے۔ اور چونکہ یہ شرط، صحابہ میں پائی جاتی تھی اس لیے یہ آیت، اثباتِ رسالت کے ساتھ بشارت بھی ہوگئی، صحابہ کے لیے فتوحاتِ عامہ کی۔ چنانچہ ایسا ہی واقع ہوا۔''

اساطینِ علم کی مندرجہ بالا تشریحات سے یہ بات واضح ہے کہ 'اظہارِ دین' کے معنی باطل پر حق کے غلبے کے ہیں، اور اس غلبے کے لیے جدوجہد کا وجوب محض دورِ نبوی تک محدود نہیں ہے اور نہ سرزمینِ حجاز تک محدود ہے۔ اظہارِ دین کے ذرائع دعوت اور جہاد ہیں۔ جہاد کو اُسی وقت بطور ذریعہ اختیار کیا جاسکے گا، جب دعوت کے راستے بند کردیے جائیں اور دعوت کے ذریعے پیش رفت ممکن نہ رہے۔ جہاد کی شرائط کی تکمیل کے علاوہ حدود کی پابندی، آداب کا التزام اور معاہدوں کا لحاظ بھی ضروری ہوگا۔

☆☆☆

انسانی سماج میں صالح تبدیلی

آج کی دنیا جن انقلابات سے واقف ہے وہ حیاتِ انسانی کے اجتماعی اور سیاسی پہلو سے بحث کرتے ہیں۔ اصلاً اُن کو فردِ انسانی کے اندرون سے اور اس کی شخصیت سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ ایسے انقلابات کے داعیوں کے درمیان فرد کی زندگی اگر زیرِ بحث آتی بھی ہے تو عموماً محض اس بنا پر کہ فرد ہی انقلابی تحریک کا کارکن ہوتا ہے۔ فرد کے متعلق غور کرنے کا محرک، آج کی اجتماعی فضا میں یہ داعیہ ہوتا ہے کہ فرد کو کسی تحریک کا اچھا کارکن کس طرح بنایا جائے۔ اس رجحان کی بنا پر انسانوں کی حیثیت تقریباً وہی قرار پاتی ہے جو مادی وسائل کی ہوتی ہے۔ جس طرح تحریک چلانے اور تبدیلی لانے کے لیے سرمایہ اور مال درکار ہوتا ہے اسی طرح انسان بھی درکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ 'انسانی وسائل' کی اصطلاح اکثر استعمال کی جاتی ہے۔ منصوبہ بندی میں آج کی اجتماعی تحریکیں، جس طرح روپیہ پیسہ حاصل کرنے پر توجہ کرتی ہیں تاکہ اپنے اخراجات کو پورا کرسکیں اسی طرح انسانوں کو بھی اپنی پارٹی کا اچھا کارکن (ورکر) بنانے کی کوشش کرتی ہیں جو پارٹی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ کارکن کے حسنِ کردار کے بجائے اس کی اچھی کارکردگی مطلوب ہوتی ہے۔ کارکنوں کی تربیت کے لیے کوششیں بھی اسی رخ پر کی جاتی ہیں۔ پارٹی ایک مشین کی طرح کام کرنا چاہتی ہے اور اُسے انسانی کارکنوں کی شکل میں اچھے کل پرزے درکار ہوتے ہیں۔

اسلام کا منفرد مزاج

آج کی اجتماعی تحریکوں کے برعکس، اسلام کی دعوت، فرد اور سماج دونوں کے لیے

ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان، وسیلہ نہیں ہے۔ اسلام فرد کو محض معاشرے کی اکائی نہیں سمجھتا بلکہ ایک ایک شخص کی منفرد شخصیت کو تسلیم کرتا ہے۔ دینی نظام میں اس شخصیت کی تکمیل، ارتقاء اور تزکیہ، بذاتِ خود مطلوب ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی کاموں میں تزکیہ کا تذکرہ کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الجمعہ:۲)

''وہی اللہ ہے جس نے اُمیوں میں ایک رسول، اُنہی میں سے مبعوث کیا، جو اُن کو اُس کی آیات سناتا ہے، اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس سے پہلے وہ صریح گم راہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلیدی فرائض میں تزکیہ کے تذکرے کے علاوہ، قرآن مجید ہر صاحبِ ایمان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کی طرف متوجہ رہے تاکہ اُسے کام یابی حاصل ہو سکے۔ مثلاً ارشاد ہوا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ (اعلیٰ:۱۴-۱۵)

''بے شک کام یاب ہوا وہ جس نے اپنا تزکیہ کیا اور اپنے رب کا نام لیا پھر نماز ادا کی۔''

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس:۷-۱۰)

''قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جیسا کہ اُس کو درست کیا پھر اُسے برائی اور بھلائی کی سمجھ دی۔ بے شک وہ کام یاب ہوا جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور بے شک وہ نامراد ہوا جس نے نفس کو دبا دیا۔''

معاشرے کی اہمیت

فرد کے تزکیہ پر توجہ کے ساتھ اسلام کی دعوت، انسانی سماج کی مستقل اہمیت کو بھی

تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ مطلوب یہ ہے کہ سارا سماج، کتاب ہدایت سے وابستگی اختیار کرے۔ ارشاد ہوا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۰۳)

''اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور متفرق نہ ہو جاؤ۔ اور یاد کرو اللہ کے احسان کو کہ تم آپس میں دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں باہم محبت ڈال دی اور تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تمہیں اس سے نجات دی۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

معاشرے کی اہمیت کی بنا پر اللہ چاہتا ہے کہ انسانی معاشرے میں عدل قائم ہو:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحدید: ۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیاں دے کر بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ، انصاف (قسط) پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اُتارا۔ اُس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ (یہ سب اس لیے ہوا) کہ اللہ دیکھے کہ کون بغیر دیکھے، اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ قوی اور زبردست ہے۔''

سماج کی اہمیت یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے سماج کے اندر بگاڑ کے پھیلنے کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ اس نے بے حیائی پھیلانے والوں کو عذابِ آخرت کے ساتھ عذابِ دنیا سے بھی

ڈرایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (النور:۱۹)

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے درمیان، بے حیائی پھیلائیں، اُن کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا میں اور آخرت میں۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

فرد اور سماج کا تعلق

اسلام، انسانی شخصیت کی اس طرز پر تربیت کرتا ہے کہ ہر ایمان لانے والا، معاشرے کی اصلاح کو اپنی ذمہ داری سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کو ایمان کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح فرد کے شعور کی بیداری اور اُس کی فرض شناسی، سماج کو درست رکھنے میں معاون بنتی ہے۔ دوسری جانب، اسلام پورے سماج کو اور خصوصاً اس کے اہم اداروں کو توجہ دلاتا ہے کہ اجتماعی ماحول کی درستگی کے ذریعے، افراد کی تکمیلِ ذات کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کریں تاکہ ہر فرد، اپنے خالق کی بندگی، آسانی سے کرسکے۔ فرد اور معاشرے کے مابین یہ تعاون، اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اسلام کے برعکس، آج کے باطل نظریات، فرد اور سماج میں تصادم کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اسلام کے مذکورہ بالا مزاج کی ترجمانی ان آیات میں کی گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○ (الحج:۴۱)

''یہ اہلِ ایمان، وہ لوگ ہیں جن کو ہم زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور ہر معاملے کا انجامِ کار، اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ

الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِیْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِیْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

(النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں، اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے کہ اللہ انھیں، زمین میں اقتدار بخشے گا جس طرح اُن سے پہلے کے اہلِ ایمان کو اقتدار دے چکا ہے۔ اور وہ اُن کے لیے، اُن کے دین کو جمادے گا، جس کو اُس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ اور وہ خوف کے بعد اُن کو امن عطا کرے گا۔ وہ میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اور جو کوئی اس کے بعد کفر کا رویہ اختیار کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔''

اجتماعی اداروں میں حکومت کا ادارہ، نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ انسانی زندگی پر اُس کے اثرات ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ اس اہمیت کی بنا پر مندرجہ بالا آیات میں اقتدار ملنے کے بعد، اہلِ ایمان کے مطلوبہ طرزِ عمل کو بیان کیا گیا ہے تاکہ ہر دور کے مسلم معاشرہ کو صحیح رہ نمائی مل سکے۔

صالح تبدیلی کا مفہوم

اسلامی انقلاب کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے میں اللہ کی بندگی ہونے لگے، حق کی روشنی سے حیاتِ انسانی کا ہر دائرہ منور ہوجائے، ہدایتِ الٰہی پر عمل کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور ہوجائیں اور باطل ادیان پر حق غالب ہوجائے۔

اس انقلاب کی جہتیں (Dimensions) متعدد ہیں: مثلاً فرد کی تکمیلِ ذات اور اُس کی شخصیت کا ارتقاء، مسلم معاشرے کی اصلاح، مسلمان سماج کے نظامِ اجتماعی کی تعمیر، عام انسانی معاشرے کی درستگی، باطل افکار کے اثرات کا خاتمہ، سیاسی نظاموں، اداروں اور حکومتوں کی اصلاح، مسلمان معاشرے کی آزادی اور منصفانہ بین الاقوامی قوانین کا نفاذ۔ یہ ساری جہتیں، اُن اہم اسلامی اصطلاحات کا تقاضا ہیں جن کے ذریعے قرآن مجید امتِ مسلمہ

کی ذمہ داریوں کو بیان کرتا ہے یعنی دعوت الی اللہ، جہاد فی سبیل اللہ، اعلاءِ کلمۃ اللہ، نصرتِ دین، شہادت علی الناس، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ دین، اقامتِ قسط، دعوت الی الخیر اور اظہارِ دین۔

اپنی تمام جہتوں میں اسلامی انقلاب کے ظہور کے لیے تین شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کے اندر ایسے افراد کی بڑی تعداد موجود ہو جن کا ایمان زندہ، شعوری اور پختہ ہو، جنہیں اللہ سے کیا ہوا عہدِ بندگی یاد ہو اور جو حسنِ عمل کا اہتمام کرتے ہوں۔ ایسے اصحابِ ایمان کی موجودگی کے بغیر، اسلامی انقلاب کا خواب دیکھنا، خام خیالی ہے۔ مزید برآں اسلامی انقلاب کے ظاہر ہونے کے لیے ایک مزید شرط کی تکمیل بھی ضروری ہے کہ ایمان و عمل سے آراستہ، صالح افراد کو امت کے مشن کا واضح شعور حاصل ہو۔ وہ امت کے فرضِ منصبی کو جانتے ہوں، اس کے تقاضوں سے واقف ہوں اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے متحرک ہوں۔ امت کا مشن یا فرضِ منصبی، قرآنی الفاظ میں درجِ ذیل ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (آلِ عمران:۱۱۰)

''تم خیرِ اُمت ہو، تمہیں انسانوں (کی ہدایت و اصلاح) کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اُمت میں دین کا احیا

ایمان و عمل اور منصبی شعور کے استحضار کے ساتھ اسلامی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کے لیے ایک تیسری شرط بھی درکار ہے۔ وہ یہ ہے کہ افرادِ امت کی تعلیم و تربیت کا وسیع اور اطمینان بخش انتظام کیا جائے۔ یہ اہتمام ایسا ہو کہ کوئی مسلمان، بنیادی علمِ دین سے محروم نہ رہے۔ ساتھ ہی اہلِ دانش کی ایک معقول تعداد، اُمت میں ایسی پائی جائے جو علم و تقویٰ کی

صفات کے ساتھ دین میں گہری بصیرت بھی حاصل کرے تا کہ مسلمانوں کی رہ نمائی بھی کر سکے اور عام انسانوں کی بھی۔

اس تیسری شرط کے سلسلے میں قرآنی آیات درج ذیل ہیں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آل عمران: ۱۶۴)

''بلاشبہ اہلِ ایمان پر اللہ نے یہ بڑا احسان کیا کہ اُن کے درمیان، خود انہی میں سے ایک ایسا رسول اٹھایا جو اُس کی آیات، انہیں سناتا ہے، اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝ (التوبہ: ۱۲۲)

''اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان، سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے کہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔''

اسلامی انقلاب کے لیے درکار شرائط کے اس تذکرے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انقلاب اسلامی کے طالبین کو موجودہ مسلمان معاشرہ کا جائزہ لے کر ایک وسیع مہم چلانی ہوگی تا کہ مسلمان سماج کو بیدار کیا جا سکے۔ اس مہم کے اہداف یہ ہوں گے:

(الف) ایمان کو زندہ اور شعوری ایمان بنانے کی ترغیب اور بیداریِ ایمان کی تدبیروں کی نشان دہی۔

(ب) اُمت کے فرضِ منصبی کی تفہیم اور یاد دہانی۔

(ج) مسلمانوں کی تعلیم اور تزکیہ کے لیے سعی۔ اس مقصد کے لیے پہلے سے مصروفِ عمل اجتماعی اداروں اور کاوشوں کو قرآن وسنت کا پابند بنانا۔

امت میں دین کے احیاء کی اس وسیع مہم کے بغیر اسلامی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ دین کے ہمہ گیر تقاضوں کا حق ادا کرنا کسی ایک ادارے یا تنظیم کے بس کی بات نہیں۔ دین کی اقامت کے لیے پوری امت کے اندر دینی روح پھونکنا ضروری ہے۔ چنانچہ جو مخلص احباب، اسلامی انقلاب کی آرزو لے کر سرگرمِ عمل ہیں، انہیں اُمت پر توجہ دینی ہوگی۔

نہیں اقبال نا امید اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اسلامی انقلاب کی متعدد جہتوں کے بیان کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُن میں لازماً کوئی ناگزیر زمانی ترتیب پائی جاتی ہے۔ فطری کیفیت یہ ہے کہ متنوع جہتوں میں پیش رفت ایک ساتھ ہوتی ہے۔ جس رفتار سے ایمان زندہ ہوتا ہے، شعور میں تابندگی آتی ہے اور دین کے تقاضے واضح ہوتے ہیں، اسی رفتار سے افراد، سماج اور اجتماعی اداروں میں اصلاح ہونے لگتی ہے۔ ایک گوشے میں پیش رفت، دوسرے دائروں میں صالح تغیر میں معاون بنتی ہے اور انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ ایک دانے کو بونے سے کس طرح سینکڑوں دانوں پر مشتمل فصل حاصل ہوجاتی ہے۔ البتہ اس خوش گوار نتیجے کے ظہور کے لیے اخلاص، صبر، قربانی اور پیہم کوشش درکار ہے۔

درکار تبدیلی کی جہتیں

اسلامی انقلاب کی ہمہ گیر نوعیت کے سمجھ لینے سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ صالح انقلاب، ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ ایمان سے محروم کوئی انسان، ایمان لے آئے تو اُس کی زندگی کی حد تک یہ ایک انقلابی تبدیلی ہے۔ کسی دل میں خوابیدہ ایمان جاگ جائے اور عمل کی توفیق مل جائے تو اس بیداری کو انقلاب کہنا مناسب ہے۔ مسلمانوں کا کوئی اجتماعی

کام، درست خطوط پر استوار ہوجائے تو یہ انقلابی قدم ہوگا۔ کوئی مسجد، بستی کے باشندوں کی اصلاح و تربیت کا مرکز بن جائے اور امامِ مسجد لوگوں کی رہ نمائی کے فرائض انجام دینے لگے تو یہ انقلابی تغیر ہے۔ ملک میں رائج ظالمانہ قوانین منسوخ ہوجائیں اور اُن کی جگہ منصفانہ قانون نافذ کیا جائے تو یہ انقلابی اقدام ہے۔ سماج سے کوئی منکر مٹ جائے اور اس کی جگہ معروف قائم ہوجائے تو یہ انقلابی پیش رفت ہے۔ اس وسیع تصور کے ساتھ جب داعیانِ انقلاب کوشش کرتے ہیں تو سعی و جہد کے یہ چھوٹے چھوٹے دھارے مل کر ایک سیلابِ رواں بن جاتے ہیں، جس میں باطل کے خس و خاشاک کو بہالے جانے کی بے نظیر صلاحیت ہوتی ہے۔ صالح انقلاب کی تکمیل بہرحال اُس وقت ہوتی ہے جب اللہ کی تائید و نصرت کے نتیجے میں اہلِ حق کو زمین میں اقتدار حاصل ہوجاتا ہے۔ قرآن مجید نے اس تکمیلی مرحلے کا ذکر کیا ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا○ (نصر)

''جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہوجائے اور تم دیکھ لو کہ لوگ، فوج در فوج، اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو۔ اور اُس سے مغفرت کی دعا مانگو۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ○ (الصف: ۱۴)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: کون ہے اللہ کی طرف (بلانے میں) میرا مددگار؟ اور حواریوں نے جواب دیا تھا: ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ اُس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی اُن کی دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی (ایمان لانے والے) غالب ہوکر رہے۔''

صالح انقلاب اور تاریخِ انسانی

انسانی زندگی میں حق کا غلبہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ میں متعدد بار، حق غالب ہوا ہے۔ جہاں تک تاریخ کے آغاز کا تعلق ہے، انسانوں کے معاشرے کی ابتدا، حق کی روشنی میں ہوئی۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (البقرہ: ۲۱۳)

''ابتدا میں سارے انسان ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے، جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور اُن کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔ (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں بلکہ) اختلاف اُن لوگوں نے کیا، جنہیں حق کا علم دیا جاچکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد، محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے، انہیں اللہ نے اپنے اِذن سے اُس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے، راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

دوسری مثال نوح علیہ السلام سے متعلق ہے جو جلیل القدر پیغمبروں میں سے ہیں۔ اُن کی قوم کی بڑی تعداد ایمان نہیں لائی چنانچہ عذابِ الٰہی سے ہلاک کر دی گئی۔ تھوڑے سے لوگ ایمان لائے۔ قرآن مجید بتاتا ہے کہ اللہ نے اُن ایمان والوں کو زمین کا وارث بنایا:

فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ۝ (یونس: ۷۳)

''انھوں نے (یعنی نوح کی قوم کے لوگوں نے) نوح کو جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اُسے اور اُن لوگوں کو جو (ایمان لے آئے تھے اور) اُس کے ساتھ کشتی میں تھے، بچالیا اور انہی کو زمین میں جانشین بنایا۔ اور ان سب کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ پس دیکھ لو جن کو خبردار کیا گیا تھا، ان کا کیا انجام ہوا۔''

مندرجہ بالا آیت بتاتی ہے کہ نوح علیہ السلام کے پیرو، زمین کے جانشین بنائے گئے۔ کتنے عرصے تک اُن کو اللہ نے کام کرنے کا موقع دیا، قرآن اس کی صراحت نہیں کرتا۔ البتہ اتنی بات واضح ہے کہ کچھ عرصہ ضرور انھوں نے نوح علیہ السلام کی براہِ راست رہنمائی میں گزارا، جبکہ زمین کے اس خطے سے خدا کے باغی مکمل طور پر مٹائے جا چکے تھے۔ ظاہر ہے، نوح علیہ السلام کی زندگی کا یہ آخری دور (خواہ طویل رہا ہو یا مختصر) اُس خطۂ زمین پر حق کے غلبے کا دور تھا۔

ہود علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اُن کی قوم عاد کے زیادہ تر افراد نے دعوتِ حق قبول کرنے سے انکار کیا چنانچہ اللہ کے عذاب نے اُن کو ہلاک کر دیا۔ رہے تھوڑے سے لوگ جو ہود علیہ السلام پر ایمان لائے تھے تو اللہ نے اُن کو زمین میں آباد کیا۔ اُن کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ بات عرب کے تاریخی مسلّمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصہ باقی رہا جو حضرت ہود علیہ السلام کا پیرو تھا۔ حصن غراب کا کتبہ...... انہی کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کتبہ میں...... ماہرین آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اُس کے چند جملے یہ ہیں: ہم نے ایک طویل زمانہ اس قلعے میں اس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی، تنگی و بدحالی سے دور تھی۔ ہماری نہریں، دریا کے پانی سے لبریز رہتی تھیں......اور ہمارے حکم راں، ایسے بادشاہ تھے جو برے خیالات سے پاک اور اہلِ شر و فساد پر سخت تھے۔ وہ ہم پر ہود کی شریعت کے مطابق حکومت کرتے تھے اور عمدہ فیصلے ایک

کتاب میں درج کر لیے جاتے تھے۔ اور ہم معجزات اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر یقین رکھتے تھے۔

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی قدیم عظمت و شوکت اور خوش حالی کے وارث آخر کار وہی لوگ ہوئے، جو حضرت ہودؑ پر ایمان لائے تھے۔" (تفہیم القرآن، سورہ اعراف، حاشیہ ۵۶)

ایک اور مثال بنی اسرائیل کی ہے۔ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے اس گروہ کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے مردِ صالح، طالوت کی قیادت میں جہاد کیا تھا۔ اس لشکر میں داؤد علیہ السلام شامل تھے جو ابھی نبی مقرر نہ ہوئے تھے۔ قرآن مجید نے اُن کے کارنامے کا تذکرہ کیا ہے:

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ (البقرہ:۲۵۱)

"آخر کار اللہ کے اذن سے انھوں نے (یعنی طالوت کے ساتھیوں نے) کافروں کو مار بھگایا اور داؤد نے (کافروں کے سردار) جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اللہ نے اُسے (یعنی داؤد کو) سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اُسے علم دیا۔ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے نہ ہٹاتا رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔ لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح، دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)۔"

داؤد علیہ السلام کو حکومت ملی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حق کے ساتھ حکومت کرنے کی ہدایت کی:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ○ (ص:۲۶)

"(ہم نے داؤد سے کہا) اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو

لوگوں کے درمیان، حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں، یقیناً اُن کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔''

داوٗد اور سلیمان علیہما السلام، اللہ کے پیغمبروں میں سے تھے۔ ظاہر ہے اُن کی حکومت کا دور، حق کے غلبے کا دور تھا۔ غلبۂ حق کی ایک اور مثال یہ ہے کہ قرآن مجید نے مردِ صالح، ذوالقرنین کا ذکر کیا ہے۔ اس کا اقتدار وسیع تھا:

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ وَاٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ۝ (الکہف: ۸۴)

''ہم نے اُسے (یعنی ذوالقرنین کو) زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب ووسائل بخشے تھے۔''

اُس کی صالحیت کا یہ عالم تھا کہ بہت مضبوط دیوار بنانے کا بعد بھی، وہ اس حقیقت کا ادراک رکھتا تھا کہ جب اللہ چاہے گا، یہ دیوار گر جائے گی:

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ۝ (الکہف: ۹۸)

''ذوالقرنین نے کہا کہ یہ (دیوار) میرے رب کی رحمت ہے، مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوندِ خاک کر دے گا۔ اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔''

ظاہر ہے کہ ذوالقرنین کی حکومت کا دور، حق کے غلبے کا دور تھا۔

سورۂ صف کی آخری آیت کا تذکرہ کیا جا چکا ہے جس کے مطابق، عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص پیرووں نے اپنے مخالفین پر فتح پائی۔ اس کے بعد ان اہلِ ایمان کو حکومت کا کچھ موقع ملا ہوگا۔ یہ واقعہ بھی غلبۂ حق کی مثال ہے۔

دورِ حاضر اور صالح انقلاب

عالمِ نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نواؤں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرہ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

صالح تبدیلی کے امکانات کی دنیا جس طرح کل وسیع تھی، آج بھی وسیع ہے۔ کل حق، زمین پر غالب ہوسکتا تھا تو آج بھی غالب ہوسکتا ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ پہلے بھی زمین پر حق وصداقت کی فتح کے لیے کوشش اور قربانی درکار تھی، اوراسی طرح آج بھی درکار ہے۔ اسلامی انقلاب کے امکانات کے دائرے میں وسعت لانے کے لیے اہلِ ایمان کو جو طریق کار اختیار کرنا ہوتا ہے، اُس کے بنیادی عناصر دو ہیں: دعوت اور جہاد۔ دعوت سے دل متاثر ہوتے ہیں، ذہن مفتوح ہوتے ہیں اور فطرتِ انسانی، خوابِ غفلت سے بیدار ہوتی ہے۔ پھر جن کے اندر حق کی سچی طلب ہوتی ہے اور انسانوں کے خوف سے جن کے دل آزاد ہوتے ہیں، وہ حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ حق کے دامن میں آنے والے ہر شخص کی آمد کے ساتھ، دعوتِ حق کے فروغ کے اور حق کی فتح کے امکانات بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک کی جرأت دوسروں کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے اور ہر خدا پرست، ناواقف انسانوں تک پیغامِ حق کی ترسیل کے نئے امکانات اپنے ساتھ لاتا ہے۔

یہی معاملہ جہاد کا ہے۔ اصلاحی جہاد اس وقت کیا جاتا ہے جب حق کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ حق کو عام کرنے، اُسے قبول کرنے اور دینِ حق پر عمل کرنے کی راہ میں جو رکاوٹ بھی حائل ہو، اس کو دور کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ یہ کوشش اسلامی حدود و آداب کے دائرے میں رہ کر ہی کی جاسکتی ہے۔ اس سرگرمی کو اسلام نے جہاد کا نام دیا ہے۔ جہاد کے لیے اسلام کی عائد کردہ بنیادی شرطیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ معاہدوں کی پابندی کی جائے (یعنی اُن معاہدوں کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی جو مسلمان افراد، گروہوں یا حکومتوں نے غیر مسلموں یا اُن کی حکومتوں سے کیے ہوں)۔ جہاد کے درست ہونے کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ فساد فی الارض سے بچا جائے۔ اس ہدایت کی تفصیلات حدیث و فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

دعوت کی طرح، اللہ کی راہ میں جہاد کے ذریعے بھی غلبۂ حق کے امکانات وسیع

ہوتے ہیں۔ دعوت و جہاد کے طریقِ کار کو اپناتے ہوئے، اہلِ ایمان کو، دین کے قیام کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ غلبۂ حق کی منزل آجائے تو یہ اللہ کا فضل ہے۔ اگر کسی حق پرست کی زندگی میں یہ منزل نہ بھی آئے تب بھی، پیش قدمی اور جدوجہد، مومن کی تکمیلِ ذات کا ذریعہ ہے۔

ہر انقلاب کی تاریخ یہ بتاتی ہے
وہ منزلوں پہ نہ پایا جو رہ گزر سے ملا

++